۴

نئی لائبریری

سڑک کے کنارے

افسانے

سعادت حسن منٹو

نیا ادارہ

5.00

سڑک
کے
کنارے

منٹو صداقت کا علمبردار ہے۔ اُسے بناوٹ، ریا اور تصنع کے پردوں کو چاک کرنے میں بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔ وہ سماج اور حکومت پر دو دھاری تلوار سے بے رحمانہ حملے کرتا ہے اور ان کے گلے سڑے حصوں کو جزا اور سزا کی پروا کیے بغیر کاٹتا چلا جاتا ہے۔

محفلِ افسانہ میں وہ ہر بار ایک نئے اوز دل کش انداز سے شرکت کا عادی ہے۔ "سڑک کے کنارے" میں اس نے پہلے سے زیادہ جدید، نڈر اور بے باک انداز کی ترجمانی کی ہے۔

"سڑک کے کنارے" کے تمام افسانے منٹو کی فنی پختگی کی عمدہ مثال ہیں لیکن "موذیل" تو منٹو کے چند بہترین افسانوں میں سے ایک ہے اور اسے بلاشبہ اردو کے عظیم افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

سعادت حسن منٹو

سڑک کے کنارے

نیا ادارہ • لاہور

یہ ننھے چراغ - یہ ننھے سرواد
صرف اپنے لئے چمکتے ہیں -
جو کچھ یہ دیکھتے ہیں، جو کچھ یہ سُنتے ہیں
کسی کو نہیں بتاتے -

(چراغ جلتے سرِ راہ ـــ میاں تلطف)

فہرست

شلواں، ۹

لتیکا رانی، ۲۳

نفسیاتی مطالعہ، ۴۳

موتری، ۵۷

نطفہ، ۶۱

سڑک کے کنارے، ۷۹

سراج، ۹۱

سو کینڈل پاور کا بلب، ۱۱۱

خدا کی قسم، ۱۲۸

موذیل، ۱۳۷

صاحب کرامات، ۱۵۵

شاداں

خان بہادر محمد اسلم خان کے گھر میں خوشیاں کھیلتی تھیں — اور صحیح صحنوں میں کھیلتی تھیں۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں، ایک لڑکا۔ اگر بڑی لڑکی کی عمر تیرہ برس کی ہوگی تو چھوٹی کی یہی گیارہ ساڑھے گیارہ اور جو لڑکا تھا، گو سب سے چھوٹا مگر قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ اپنی بڑی بہنوں کے برابر معلوم ہوتا تھا۔

تینوں کی عمر جیسا کہ ظاہر ہے، اُس دور سے گذر رہی تھی جب کہ ہر آس پاس کی چیز کھلونا معلوم ہوتی ہے۔ حادثے بھی یوں آتے ہیں، جیسے ربڑ کے اڑتے ہوئے غبارے۔ ان سے بھی کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔

خان بہادر محمد اسلم کا گھر خوشیوں کا گھر تھا — اس میں سب سے بڑی تین خوشیاں اس کی اولاد تھیں۔ فریدہ، سعیدہ اور نجیب۔ یہ تینوں اکھلی

جاتے تھے جیسے کھیل کے میدان میں جاتے ہیں۔ ہنسی خوشی جاتے تھے ہنسی خوشی واپس آتے تھے اور امتحان یوں پاس کرتے تھے جیسے کھیل میں کوئی ایک دوسرے سے بازی لے جائے۔ کبھی فریدہ فرسٹ آتی تھی، کبھی نجیب اور کبھی سعیدہ۔

خان بہادر محمد اسلم خان بچوں سے مطمئن، ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے انھوں نے محکمہ زراعت میں پینتیس برس نوکری کی تھی۔ معمولی عہدہ سے بڑھتے بڑھتے وہ بلند ترین مقام پر پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے بڑی محنت کی تھی، دن رات دفتری کام کیے تھے ـــــ اب وہ سستا رہے تھے۔ اپنے کمرے میں کتابیں لے کر پڑے رہتے اور ان کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ فریدہ، سعیدہ اور نجیب کبھی کبھی ماں کا کوئی پیغام لے کر آتے تو وہ اس کا جواب بھجوا دیتے۔

ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنا بستر وہیں اپنے کمرے میں لگوا لیا تھا۔ دن کی طرح ان کی رات بھی یہیں گزرتی تھی ـــــ دنیا کے جھگڑے ٹنٹوں سے بالکل الگ۔ کبھی کبھی ان کی بیوی جو ادھیڑ عمر کی عورت تھی ان کے پاس آجاتی اور چاہتی کہ وہ اس سے دو گھڑی باتیں کریں مگر وہ جلد ہی اسے کسی بہانے سے ٹال دیتے۔ یہ بہانہ عام طور پر فریدہ اور سعیدہ کے جہیز کے متعلق ہوتا "جاؤ، یہ عمر چونچلے بگھارنے کی نہیں ـــــ گھر میں دو جوان بیٹیاں ہیں، ان کے دان دہیج کی فکر کرو ـــــ سونا دن بدن مہنگا ہو رہا ہے۔ دس بیس تولے خرید کر کیوں نہیں رکھ لیتیں ـــــ وقت آئے گا تو پھر چیخو گی کہ ہائے اللہ، خالی زیوروں پر اتنا روپیہ

اٹھ رہا ہے۔"

یا پھر وہ کبھی اس سے یہ کہتے۔" فرخندہ خانم ــ میری جان ہم بُڈھے ہو چکے ہیں ــ تمہیں اب میری فکر اور مجھے تمہاری فکر ایک بچّے کی طرح کرنی چاہیئے ــ میری ساری پگڑیاں لیر لیر ہو چکی ہیں مگر تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ململ کے دو تھان ہی منگوا لو ــــ دو نہیں چار ــــ تمہارے اور بچیوں کے دوپٹے بھی بن جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم چاہتی کیا ہو؟ ــــ اور ہاں وہ میری مسواکیں ختم ہو گئی ہیں۔"

فرخندہ خان بہادر کے پلنگ پر بیٹھ جاتی اور بڑے پیار سے کہتی۔" ساری دنیا برش استعمال کرتی ہے۔ آپ ابھی تک پرانی لکیر کے فقیر بنے ہیں۔"

خان بہادر کے لہجے میں نرمی آجاتی۔" نہیں فرخندہ جان ــــ یہ برش اور ٹوتھ پیسٹ سب واہیات چیزیں ہیں۔"

فرخندہ کے ادھیڑ چہرے پر لکیروں کی کڑیاں اور مرلیاں سی بکھر جاتیں ــ مگر صرف ایک لمحے کے لئے۔ خان بہادر اس کی طرف دیکھتے اور باہر صحن میں بچوں کی کھیل کود کا شور و غل سنتے ہوئے کہتے" فرخندہ ــ توکل ململ کے تھان آجائیں ــــ اور لٹھے کے بھی۔" لیکن فوراً ہی معلوم نہیں کیوں اُن کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ جاتی اور وہ فرخندہ کو منع کر دیتے۔" نہیں نہیں، لٹھا منگوانے کی ابھی ضرورت نہیں ــ!"

باہر صحن میں بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے۔ سہ پہر کو شاداں عموماً ان کے ساتھ ہوتی۔ یہ گو نئی نئی آئی تھی، لیکن ان میں فوراً ہی گھل مل گئی تھی۔ سعیدہ اور فریدہ تو اس کے انتظار میں رہتی تھیں کہ وہ کب آئے اور سب مل کر "لنگن میٹی" یا "کھدو" کھیلیں۔

شاداں کے ماں باپ عیسائی تھے، مگر جب سے شاداں خان بہادر کے گھر میں داخل ہوئی تھی، فریدہ کی ماں نے اس کا اصلی نام بدل کر شاداں رکھ دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی اور اس کی بچیاں اس سے پیار کرنے لگی تھیں۔

شاداں جب صبح سویرے آتی تو فریدہ، سعیدہ اور نجیب اسکول جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوتے۔ وہ اس سے باتیں کرنا چاہتے، مگر ماں ان سے کہتی "بچو جلدی کرو — اسکول کا وقت ہو رہا ہے"

اور بچے جلدی جلدی تیاری سے فارغ ہو کر شاداں کو سلام کہتے ہوئے اسکول چلے جاتے۔

سہ پہر کے قریب شاداں جلدی جلدی محلے کے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر آجاتی اور فریدہ، سعیدہ اور نجیب کھیل میں مشغول ہو جاتے اور اتنا شور مچتا کہ بعض اوقات خان بہادر کو اپنے کمرے سے نوکر کے ذریعے سے کہلانا پڑتا کہ شور ذرا کم کیا جائے — یہ حکم سن کر شاداں سہم کر الگ ہو جاتی، مگر سعیدہ اور فریدہ اس سے کہتیں "کوئی بات نہیں شاداں — ہم اس سے بھی زیادہ شور مچائیں

تو وہ اب کچھ نہیں کہیں گے۔ ایک سے زیادہ بار وہ کوئی بات نہیں کہا کرتے"۔
اور کھیل پھر شروع ہو جاتا۔ کبھی کمن چھی، کبھی کھدو اور کبھی لوڈو۔
لوڈو، شاداں کو بہت پسند تھی، اس لئے کہ یہ کھیل اس کے لئے نیا تھا۔ چنانچہ جب سے نجیب لوڈو لایا تھا، شاداں اسی کھیل پر مصر ہوتی۔ مگر فریدہ، سعیدہ اور نجیب تینوں کو یہ پسند نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوتا۔ بس وہ چوں چوں سا ہوتا ہے، اس میں پانسہ ہلاتے اور پھینکتے رہو اور اپنی گوٹیں آگے پیچھے کرتے رہو۔
شاداں کھلی کھلی رنگت کی درمیانے قد کی لڑکی تھی۔ اس کی عمر فریدہ جتنی ہوگی مگر اس میں جوانی زیادہ نمایاں تھی ——— جیسے خود جوانی نے اپنی شوخیوں پر لال پنسل کے نشان لگا دیئے ہیں ——— محض شرارت کے لئے، ورنہ فریدہ اور سعیدہ میں وہ تمام رنگ، وہ تمام لکیریں، وہ تمام قوسیں موجود تھیں جو اس عمر کی لڑکیوں میں ہوتی ہیں۔ لیکن فریدہ، سعیدہ اور شاداں جب پاس پاس کھڑی ہوتیں تو شاداں کی جوانی زیرِ لب کچھ گنگناتی معلوم ہوتی۔
کھلی کھلی رنگت۔ پریشان بال اور دھڑکتا ہوا دوپٹہ جو کس کر اس نے اپنے سینے اور کمر کے اردگرد باندھا ہوتا۔ ایسی ناک، جس کے نتھنے گویا ہوا میں انجانی خوشبوئیں ڈھونڈنے کے لئے کانپ رہے ہیں۔ کان ایسے جو ذرا سی آہٹ پر چونک کر سننے کے لئے تیار ہوں۔

چہرے کے خط و خال میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ اگر کوئی عیب گننے لگتا تو بڑی آسانی سے گن سکتا تھا، صرف اسی صورت میں اگر اس کا چہرہ اس کے جسم سے الگ کر کے رکھ دیا جاتا۔ مگر ایسا کیا جانا ناممکن تھا، اس لئے کہ اس کے چہرے اور اس کے بقایا جسم کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جس طرح چولی علیحدہ کرنے پر جسم کے آثار اس میں باقی رہ جاتے ہیں، اسی طرح اس کے چہرے پر بھی رہ جاتے اور اس کو پھر اس کی سالمیت ہی میں دیکھنا پڑتا۔

شاداں بے حد پھرتیلی تھی۔ صبح آتی اور یوں منٹوں میں اپنا کام ختم کر کے یہ جا وہ جا۔ سہ پہر کو آتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کود میں مصروف رہتی جب خان بہادر کی بیوی آخری بار چلّا کر کہتی "شاداں، اب خدا کے لئے کام تو کرو" تو وہ وہیں کھیل بند کر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ ٹوکرہ اٹھاتی اور دو دو زینے ایک جست میں طے کرتی کوٹھے پر پہنچ جاتی۔ وہاں سے فارغ ہو کر دھڑ دھڑ دھڑ نیچے اترتی اور صحن میں جھاڑو شروع کر دیتی۔

اس کے ہاتھ میں پھرتی اور صفائی دونوں چیزیں تھیں۔ خان بہادر اور اس کی بیوی فرخندہ کو صفائی کا بہت خیال تھا، لیکن مجال ہے جو شاداں نے کبھی ان کو شکایت کا موقع دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے کھیل کود پر معترض نہیں ہوتے تھے۔ یوں بھی وہ اس کو پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ روشن خیال تھے، اس لئے چھوت چھات ان کے نزدیک بالکل فضول تھی۔

شروع شروع میں تو خان بہادر کی بیوی نے اتنی اجازت دی تھی کہ لکڑی میں اگر کوئی شاداں کو چھوتے تو لکڑی استعمال کرے، اور اگر وہ چھوٹے تو لکڑی کا کوئی ٹکڑہ استعمال کرے، لیکن کچھ دیر کے بعد یہ شرط ہٹا دی گئی ابعد شاداں سے کہا گیا کہ وہ آتے ہی صابن سے اپنا ہاتھ منہ دھو لیا کرے۔

جب شاداں کی ماں کمانے کے لیئے آتی تھی تو خان بہادر اپنے کمرے کی کسی چیز سے اس کو چھونے نہیں دیتے تھے، مگر شاداں کو اجازت تھی کہ وہ صفائی کے وقت چیزوں کی جھاڑ پونچھ بھی کر سکتی ہے

صبح سب سے پہلے شاداں، خان بہادر کے کمرے کی صفائی کرتی تھی۔ وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہوتے۔ شاداں ہاتھ میں برش لیئے آتی تو ان سے کہتی

— خان بہادر صاحب — ذرا برآمدے میں چلے جایئے!

خان بہادر اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے شاداں فوراً ان کے پلنگ کے نیچے سے اُن کے سلیپر اٹھا کر ان کو پہنا دیتی اور وہ برآمدے میں بیٹھے جاتے۔

جب کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ ہو جاتی تو شاداں دروازے کی دہلیز کے پاس ہی سے کمرے میں ذرا سا جھانکنے کا خم پیدا کر کے خان بہادر کو پکارتی

"آئیے خان بہادر صاحب"

خان بہادر صاحب۔۔ اخبار اور سلیپر کھڑ کھڑاتے اندر آجاتے — اور شاداں

دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔

شاداں کو کام پڑ گئے، دو مہینے ہو گئے تھے۔ یہ گذرے تو نعمان بہادر کی بیوی نے ایک دن یوں محسوس کیا کہ شاداں میں کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ اس نے سرسری سا غور کیا تو یہی بات ذہن میں آئی کہ محلے کے کسی نوجوان سے آنکھ لڑ گئی ہوگی۔

اب وہ زیادہ بن ٹھن کے رہتی تھی۔ اگر وہ پہلے کوری ململ تھی، تو اب ایسا لگتا تھا کہ اسے کلف لگا ہوتا ہے ـــــ مگر یہ کلف بھی کچھ ایسا تھا جو ململ کے ساتھ انگلیوں میں چُنا نہیں گیا تھا۔

شاداں دن بدن تبدیل ہو رہی تھی۔ پہلے وہ اُترن پہنتی تھی، پر اب اس کے بدن پر نئے جوڑے نظر آتے تھے ـــــ بڑے اچھے فیشن کے، بڑے عمدہ سلے ہوئے۔ ایک دن جب وہ سفید لٹھے کی شلوار اور پھولوں والی جارجٹ کی قمیص پہن کر آئی تو فریدہ کو باریک کپڑے کے نیچے سفید سفید گول چیزیں نظر آئیں۔

لکن میٹی ہو رہی تھی۔ شاداں نے دیوار کے ساتھ منہ لگا کر زور سے اپنی آنکھیں میچی ہوئی تھیں۔ فریدہ نے اس کی قمیص کے نیچے سفید سفید گول چیزیں دیکھی تھیں۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ جب شاداں نے پکارا: "چھپ گئے؟" تو فریدہ نے سعیدہ کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے گئی اور دھڑکتے ہوئے

دل سے اس کے کان میں کہا "سعیدہ ۔۔ تم نے دیکھا، اس نے کیا پہنا ہوا تھا؟"

سعیدہ نے پوچھا "کس نے؟"

فریدہ نے اس کے کان ہی میں کہا "شاداں نے؟"

"کیا پہنا ہوا تھا؟"

فریدہ کی جوابی سرگوشی سعیدہ کے کان میں غڑاپ سے غوطہ لگا گئی۔ جب ابھری تو سعیدہ نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور ایک چیخ نما حیرت کی "ہیں" اس کے لبوں سے خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکلی۔

دونوں بہنیں کچھ دیر کھسر پھسر کرتی رہیں ---- اتنے میں دھماکا سا ہوا اور شاداں نے ان کو ڈھونڈھ لیا ---- اس پہ سعیدہ اور فریدہ کی طرف سے وعدے کے مطابق چیخم دھاڑ ہونا چاہیے تھی مگر وہ چپ رہیں۔ شاداں کی خوشی کی مزید چیخیں اس کے حلق میں رک گئیں۔

فریدہ اور سعیدہ کمرے کے اندھیرے کونے میں کچھ سہمی سہمی سی کھڑی تھیں شاداں بھی قدرے خوفزدہ ہو گئی۔ ماحول کے مطابق اس نے اپنی آواز دبا کر اُن سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

فریدہ نے سعیدہ کے کان میں کچھ کہا، سعیدہ نے فریدہ کے کان میں۔ دونوں نے ایک دوسری کو کہنیوں سے ٹھوکے دیئے۔ آخر فریدہ نے کانپتے

ہوئے لہجے میں شاداں سے کہا: "یہ تم نے .... یہ تم نے قمیص کے نیچے کیا پہن رکھا ہے!"

شاداں کے حلق سے ہنسی کے گول گول ٹکڑے نکلے۔

سعیدہ نے پوچھا: "کہاں سے لی تو نے یہ؟"

شاداں نے جواب دیا: "بازار سے۔"

فریدہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا: "کتنے میں؟"

"دس روپے میں!"

دونوں بہنیں ایک دم چلاتے چلاتے رک گئیں: "اتنی مہنگی!"

شاداں نے صرف اتنا کہا: "کیا ہم غریب دل کو اچھی لگنے والی چیزیں نہیں خرید سکتے؟"

اس بات نے فوراً ہی ساری بات ختم کردی ــــ تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد پھر کھیل شروع ہوگیا۔

کھیل جاری تھا۔ مگر کہاں جاری تھا، یہ خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ــــ اب تو شاداں بڑھیا قسم کا تیل بالوں میں لگاتی تھی۔ پہلے ننگے پاؤں ہوتی تھی، پر اب اس کے پیروں میں اس نے سبنڈل دیکھے۔

کھیل یقیناً جاری تھا ــــ مگر خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر کھیل جاری ہے، تو اُس کی آواز شاداں کے جسم سے کیوں نہیں

آتی۔ ایسے کھیل بے آواز اور بے نشان تو نہیں ہوا کرتے۔ یہ کیسا کھیل ہے جو صرف کپڑے کا گز بنا ہوا ہے۔

اس نے کچھ دیر اس معاملے کے بارے میں سوچا، لیکن پھر سوچا کہ وہ کیوں بیکار میں مغز پاشی کرے۔ ایسی لڑکیاں خراب ہوا ہی کرتی ہیں اور کتنی داستانیں ہیں جو ان کی خرابیوں سے وابستہ ہیں اور شہر کے گلی کوچوں میں ان ہی کی طرح رُلتی پھرتی ہیں۔

دن گذرتے رہے اور کھیل جاری رہا۔

فریدہ کی ایک سہیلی کی شادی تھی۔ اس کی ماں خان بہادر کی بیوی کی منہ بولی بہن تھی۔ اس لئے سب کی شرکت لازمی تھی۔ گھر میں صرف خان بہادر تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ رات کو خان بہادر کی بیوی کو معاً خیال آیا کہ اپنی گرم شال منگوا لے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ نوکر کو بھیج دے مگر وہ ایسے صندوق میں پڑی تھی۔ جس میں زیورات بھی تھے، اس لئے اس نے نجیب کو ساتھ لیا اور اپنے گھر آئی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ بند ہوگا، چنانچہ اس نے دستک دی۔ جب کسی نے نہ کھولا تو نجیب نے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا۔ وہ کھل گیا۔

اندر داخل ہو کر اس نے صندوق سے شال نکالی اور نجیب سے کہا۔

"جاؤ، دیکھو تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دینا کہ تم تو ابھی

سڑک کے کنارے

تم لوگ بھی زبیدہ کے بعد لوٹ آؤ گے، لیکن ہم سب کل صبح آئیں گے ___ جاؤ بیٹا!

حسنہ وہیں چیزیں قرینے سے رکھ کر دروازے کو تالا لگا رہی تھی کہ نجیب واپس آیا اور کہنے لگا "ابا جی تو اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

"اپنے کمرے میں نہیں ہیں؟ ___ اپنے کمرے میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں؟"

خان بہادر کی بیوی نے تالا بند کیا اور چابی اپنے بیگ میں ڈالی "تم یہاں ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں!"

یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر کے کمرے میں گئی جو کہ خالی تھا مگر بتی جل رہی تھی بستر پر سے خان بہادر غائب تھے۔ فرش دھلا ہوا تھا ___ ایک عجیب سی بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ خان بہادر کی بیوی چکرا گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے ___ پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا ___ لیکن ایک چیز تھی۔ اس نے پلنگ کے نیچے سے پکڑا اور باہر نکال کر دیکھا ___ خان بہادر کی ٹوٹی مسواک تھی.....

اتنے میں آہٹ ہوئی۔ خان بہادر کی بیوی نے مسواک چھپا لی ___ خان بہادر اندر داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ہی مٹی کے تیل کی بو۔ ان کا رنگ زرد تھا جیسے سارا لہو نچڑ چکا ہے۔

کانپتی ہوئی آواز میں خان بہادر نے اپنی بیوی سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں ___ شال لینے آئی تھی ___ میں نے سوچا آپ کو بھی تو دیکھ لوں۔"

صفائی:

خان بہادر کی بیوی چلی گئی — چند قدم صحن میں چلی ہوگی کہ اسے دوبارہ بند کمرے کی آواز آئی۔ وہ بیٹھ نہ سکی اپنے کمرے میں پہنچی اور پلنگ پر بے سدھ ہوکر لیٹ گئی تھی۔

دوسرے روز زبیدہ کی ماں کو پتہ چلا کہ گھر خان بہادر کی بیوی کو یہ خبر ملی کہ خان بہادر گرفتار ہو گئے ہیں — جب اس نے پتا لیا تو معلوم ہوا کہ جرم بہت سنگین ہے۔ شاداں جب گھر پہنچی تو لہولہان تھی۔ وہاں پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی۔ اس کے ماں باپ اسے ہسپتال لے گئے۔ پولیس ساتھ تھی۔ شاداں کو وہاں ایک لمحے کے لئے ہوش آیا اور اس نے صرف "خان بہادر" کہا۔ اس کے بعد وہ ایسی بے ہوش ہوئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

جرم بہت سنگین تھا۔ تفتیش ہوئی۔ مقدمہ چلا — استغاثہ کے پاس کوئی عینی شہادت موجود نہیں تھی۔ اگر صرف شاداں کے لہو میں لتھڑے ہوئے کپڑے تھے اور وہ دو لفظ جو اس نے مرنے سے پہلے اپنے منہ سے ادا کئے تھے۔۔ — لیکن اس کے باوجود استغاثہ کو پختہ یقین تھا کہ مجرم خان بہادر ہے کیونکہ ایک گواہ ایسا تھا جس نے شاداں کو شام کے وقت خان بہادر کے گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

صفائی کے گواہ صرف دو تھے۔ خان بہادر کی بیوی اور ایک ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے کہا کہ خان بہادر اس قابل ہی نہیں کہ وہ کسی عورت سے ایسا رشتہ قائم کر سکے۔ شادماں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ نابالغ تھی۔ اُس کی بیوی نے اس کی تصدیق کی۔

خان بہادر محمد اسلم خان بری ہو گئے ۔۔۔ مقدمے میں انہیں بہت کوفت اٹھانی پڑی۔ بری ہو کر جب گھر آئے تو ان کی زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک صرف انہوں نے مسواک کا استعمال چھوڑ دیا۔

لتیکا رانی

وہ خوبصورت نہیں تھی۔ کوئی ایسی چیز اس کی شکل و صورت میں نہیں تھی جسے پُرکشش کہا جا سکے، لیکن اس کے باوجود جب وہ پہلی بار فلم کے پردے پر آئی تو اس نے لوگوں کے دل موہ لیئے اور یہ لوگ جو اسے فلم کے پردے ہی پر ناچتی اداؤں کے ساتھ بڑے نرم و نازک رومانوں میں چھوٹی سی تتلی کے مانند اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تھرکتے دیکھتے تھے، سمجھتے تھے کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اُس کے چہرے مہرے اور اس کے ناز نخرے میں ان کو ایسی کشش نظر آتی تھی کہ وہ گھنٹوں اس کی روشنی میں مبہوت مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔

اگر کسی سے پوچھا جاتا کہ تمہیں لتیکا رانی کے حسن و جمال میں کون سی سب سے

پر کوئی بہت منحصر ہے جو اسے دوسری ایکٹرسوں سے جداگانہ حیثیت بخشتی ہے۔ نوتن کا اکثر یہ کہنا کہ اس کا جو لُبھاؤ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ پردے پر وہ اتنی ہی بھولی بھالی لگتی تھی۔ اس کو دیکھ کر یہ کہنا کہ فن اور زبان دماغ نہیں تھا بلکہ وہ بھولی بھالی سی تھی۔ اور ان سالوں کے بیچ نوتن کے ساتھ جو تبدیلی ہوئی تھی ان کے تاثرات سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو لاابالی اکھڑ لڑکی نے تیار کئے ہیں۔

وہ جب بھی پردے پر پیش ہوئی تو ایک معمولی ان پڑھ آدمی کی بیٹی کے روپ میں۔ نادیدہ دنیا سے دور ایک شکستہ جھونپڑی کی ساری دنیا تھی۔ کسی کسان کی بیٹی، کسی مزدور کی بیٹی، کسی کا تانگہ چلانے والے کی بیٹی۔ نوتن وہاں کردار میں کچھ اس طرح سما جاتی تھی جیسے کہ رنگ پانی میں۔

نوتن والی کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے انگنوں سے بہت اونچا گھونگھر یعنی کہ سیدھی سادی ہنسی مکھی والی مختصر سی ایک چھوٹی سی لڑکی آجاتی تھی جو ٹوٹے پھوٹے گھروندے میں بڑی گھر کے معصوم بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہے۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، پھٹی پرانی بڑے شلوار انکسار کے ساتھ بیٹھنے کا چھوٹا سا پیار، معتدل آنکھیں، شریف سی ناک، اس کے سراپا میں یوں لگتے کہ دوشیزگی کا خلاصہ ہو گیا تھا جو ہر دیکھنے والے کی سمجھ میں آجاتا تھا پہلی فلم میں آتے ہی وہ مشہور ہو گئی اور اس کی یہ شہرت اب تک قائم ہے

دیا تھا۔ اسے فلمی دنیا چھوڑے ایک مدت ہو گئی ہے۔ اپنی فلمی زندگی سے گو وہ
بڑی اس نے شہرت کے ساتھ دولت بھی پیدا کی۔ اس نے کئی انداز میں گویا ان کو
[illegible] جیسے کہ زندگی بربادی کی آمد کا علم تھا اور شعر پڑھتے تھا جو زینے بھی، جو پیشہ
اس کے انداز میں شامل کئے کہ ہر آنے والے زینے کی طرف اس کا قدم بڑھتے ہوئے
سے اٹھا ہوتا تھا۔

ٹیگارانی بہت بڑی ایکٹرس اور عجیب و غریب عورت تھی۔ ایک جرمن کی
بیوی جس نے فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے تمام فرانسیسی زبان کی بجائے
جرمن اور انگریزی زبانیں سیکھنا شروع کر دیں۔ انگلستان کے [illegible] فرانسیسی کو اس
سے محبت ہو گئی تھی۔ اس سے شادی کرنے کا وعدہ پورا ہوا۔ [illegible] لیکن
جب لندن گئی تو اس کی ملاقات ایک ہندوستانی نوجوان سے ہوئی جو وہاں
بیرسٹری پاس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹیگا نے اپنا ارادہ بدل دیا اور
دل میں طے کر لیا کہ وہ اسی سے شادی کرے گی۔ اور یہ فیصلہ اس نے بہت سوچ
بچار کے بعد کیا تھا۔ اس نوجوان بیرسٹری پاس کرنے والے [illegible] بنگالی تھا
وہ آدمی دیکھا اس کے [illegible] کی تکمیل کے [illegible] تھا۔ وہ [illegible] جس سے
اس کو محبت تھی وہ جرمنی میں [illegible] امراض کی تشخیص [illegible] میں مہارت
حاصل کر رہا تھا۔ اس سے شادی کرنے کے زیادہ سے زیادہ اسے اپنے [illegible] والے
کی دیکھ [illegible] ضمانت مل سکتی تھی جو اسے درکار نہیں تھی۔ لیکن [illegible] رہنے

ایک خواب ساز تھا۔ ایسا خواب ساز جو بڑے دیرپا خواب بُن سکتا تھا اور لتیکا اس کے اردگرد اپنی نسوانیت کے بڑے مضبوط جالے تن سکتی تھی۔

پرفلا رائے ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ بہت محنتی، وہ چاہتا تو قانون کی بڑی سے بڑی ڈگری تمام طالب علموں سے ممتاز رہ کر حاصل کر سکتا تھا مگر اسے اس علم سے سخت نفرت تھی۔ صرف اپنے ماں باپ کو خوش رکھنے کی غرض سے وہ ڈنرز میں حاضری دیتا تھا اور تھوڑی دیر کتابوں کا مطالعہ بھی کر لیتا تھا۔ ورنہ اس کا دل و دماغ کسی اور ہی طرف لگا رہتا تھا۔ کس طرف؟ یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ دن رات وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ اس کو ہجوم سے سخت نفرت تھی، پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا سارا وقت قریب قریب تنہائی میں گزرتا کسی چائے خانے میں یا اپنی بوڑھی لینڈ لیڈی کے پاس بیٹھا وہ گھنٹوں ایسے قلعے بناتا رہتا جن کی بنیادیں ہوتی تھیں نہ فصیلیں۔ مگر اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس سے کوئی نہ کوئی عمارت ضرور بن جائے گی جس کو دیکھ کر وہ خوش ہوا کرے گا۔

لتیکا جب پرفلا رائے سے ملی تو چند ملاقاتوں ہی میں اس کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہ بیرسٹری کرنے والا بنگالی معمولی آدمی نہیں۔ دوسرے مرد اس سے دلچسپی لیتے رہے تھے، اس لئے کہ وہ جوان تھی، ان میں سے اکثر نے اس کے حسن کی تعریف کی تھی، لیکن مدت ہوئی وہ اس کا فیصلہ اپنے خلاف کر چکی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی تعریف محض رسمی ہے۔ مگر اسی ڈاکٹر جو اس سے واقعی محبت کرتا تھا اس کی

صحیح معنوں میں خوبصورت سمجھتا تھا مگر لتیکا سمجھتی تھی کہ وہ اس کی نہیں اس کے پھیپھڑوں کی تعریف کر رہا ہے جو اس کے کہنے کے مطابق بے داغ تھے۔ وہ ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل وصورت کی جس میں جاذبیت تھی نہ کشش، اس نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ وہ ادھوری سی ہے۔ اس میں بہت سی کمیاں ہیں جو پوری تو ہو سکتی ہیں مگر بڑی چھان بین کے بعد اور وہ بھی اس وقت جب اس کو خارجی امداد حاصل ہو۔

پرفلا رائے سے ملنے کے بعد لتیکا نے محسوس کیا تھا کہ وہ جو بظاہر سگرٹ پر سگرٹ پھونکتا رہتا ہے اور جس کا دماغ ایسا لگتا ہے، ہمیشہ غائب رہتا ہے اصل میں سگرٹوں کے پریشان دھوئیں میں اپنے دماغ کی غیر حاضری کے باوجود اس کی شکل وصورت کے تمام اجزا بکھیر کر ان کو اپنے طور پر سنوارنے میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اس کے اندازِ تکلم، اس کے ہونٹوں کی جنبش اور اس کی آنکھوں کی حرکت کو صرف اپنی نہیں دوسروں کی آنکھوں سے بھی دیکھتا ہے، پھر ان کو اُلٹ پلٹ کرتا ہے اور اپنے تصور میں تکلم کا نیا انداز، ہونٹوں کی نئی جنبش اور آنکھوں کی نئی حرکت پیدا کرتا ہے۔ ایک خفیف سی تبدیلی پر وہ بڑے اہم نتائج کی بنیادیں کھڑی کرتا ہے اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔

لتیکا ذہین تھی، اس کو فوراً ہی معلوم ہو گیا تھا کہ پرفلا رائے ایسا معمار ہے جو اسے عمارت کا نقشہ بنا کر نہیں دکھائے گا۔ وہ اس سے یہ بھی نہیں کہے گا

کہ کہانی کی اینٹ اکھڑ کر کہاں گر گئی۔ پتہ لگ گئی تو عمارت کا مستقبل دور ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے اُس کے خیالات و افکار ہی سے سب نے انہیں پر عمل کرنا شروع کر دی تھیں۔

پر نظار اسے یہ بھی فوراً ہی محسوس کر لیا کہ اُس کا ان کے خیالات کا مطالعہ کرتی ہے اور ان پر عمل کرتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اس خاموش درس و تدریس کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔

پر نظار اسے اور اس کا دونوں ملتے تھے۔ نہ یہ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل تھا۔ یہ کہ اُس نے بھی اپنی تمام جسمانی کروٹ میں پر نظار کی خاموش تقلید کا سہارا لے رکھا تھا۔ وہ اس کے ناز و ادا کی کسوٹی تھا۔ اس کی چال پر نظار میں دیکھنے والوں سے اس کو پتہ چل جاتا تھا کہ اس کی چال کی دلکشی کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن وہ اب یہ حقیقت معلوم کر چکا تھا کہ حرارت جو اس کی نظاروں میں دیکھنے والی آنکھوں کی ہے اس کی آنکھوں کی تھی۔ وہ پوشیدہ تھی اور بالکل ایسی جو کبھی ظاہر نہ ہو پائی۔ لیکن آنکھوں کی حسرت کر اس کے خوابوں کے بال و پر لگا لینے کے بعد پر نظار کی آنکھوں کی حرارت ہی کافی تھی۔

وہ فن سہاتی والی اور انداز گیر عورت تھی۔ اس نے دو مہینے کے بعد ہی یہ حساب لگا لیا تھا کہ ایک برس کے اندر اندر اس کے خوابوں کے ہیولے کی

ابتدا ہو چلی تھی۔ کیونکہ جرمنی اور جس فضا میں ہو گی۔ یہ سوچنا [illegible] کا کام تھا اور لتیکا کو یقین تھا کہ اس کا سدا متحرک دماغ کوئی نہ کوئی راہ پیدا کرے گا۔ چنانچہ وہ دونوں جب ہندوستان واپس جانے کے ارادے سے برلن کی سیر کر رہے تھے اور برلن کا ایک دوست انہیں اوفا فلم اسٹوڈیوز میں لے گیا تو لتیکا نے پردۂ فلم کی فضا میں دیکھنے والی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنے مستقبل کی تمام جھلک دیکھ لی۔ وہ ایک مشہور جرمن ایکٹرس سے محوِ گفتگو تھا مگر لتیکا محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کے سراپا کو کیمرے کی آنکھ سے جانچ رہا تھا۔ ایکٹرس نے لتیکا کے نقش و نگار [illegible]

بمبئی پہنچے تو تاج محل ہوٹل میں پردۂ فلم کی ایک انگریز ایکٹرس سے ملاقات ہوئی جو تربیت قریب قریب خلاص تھا۔ مگر اس کی واقفیت کا دائرہ بہت [illegible] ساتھ ہی اس کی اردو زبان میں لکنت تھی اور اس کا طرز نشست برخاست پردۂ فلم کے اس سے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ مگر لتیکا رانی کی اندازہ گیر طبیعت نے فوراً بھانپ لیا کہ اس سے بڑے بڑے فیض [illegible] جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ تن من کی توجہ اور خلوص کے ساتھ اس سے ملنے جلنے لگی اور جیسا کہ لتیکا کو معلوم تھا ایک دن ذرا سی ترکیب سے خود بخود یہ طے ہو گیا کہ اس فلم کمپنی کو جو وہ قائم کرنے کا اہتمام کر رہے تھے، وہ دو بہن جو سر [illegible] سے مرعوب ہو گئے تھے [illegible] چند دن کے اندر اندر تمام مراحل طے ہو گئے جو ایک فلم کمپنی کی بنیاد ڈالنے کے لیے درپیش آتے ہیں۔

سرہاورڈ بہت کام کا آدمی ثابت ہوا، یہ پرملا کا ردِ عمل تھا، لیکن لتیکا شروع ہی سے جانتی تھی کہ وہ ایسا آدمی ہے جس کی افادیت بہت جلد پردۂ ظہور پر آجائے گی۔ وہ جب اس کی خدمت گذاری میں کچھ وقت صرف کرتی تھی تو پرملا حسد محسوس کرتا تھا، مگر لتیکا نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قربت سے بڈھا سرہاورڈ ایک گونہ جنسی تسکین حاصل کرتا تھا، مگر وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ یوں تو وہ دو مالدار مہمان بھی اصل میں اسی کی وجہ سے اپنا سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہوتے تھے اور لتیکا کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ لوگ صرف اسی وقت تک اہم تھے جب تک ان کا سرمایہ ان کی تجوریوں میں تھا، وہ ان دونوں کا تصور بڑی آسانی سے کر سکتی تھی جب یہ مارواڑی سیٹھ اسٹوڈیوز میں اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لئے بھی ترسا کریں گے لیکن یہ دن قریب لانے کے لئے اس کو کوئی عجلت نہیں تھی، ہر چیز اس کے حساب کے مطابق اپنے وقت پر ٹھیک ہو رہی تھی

لمیٹڈ کمپنی کا قیام عمل میں آگیا۔ اس کے سارے حصے بھی فروخت ہو گئے۔ سرہاورڈ میکبل کے وسیع تعلقات اور اثر و رسوخ کی وجہ سے ایک پر فضا مقام پر اسٹوڈیو کے لئے زمین کا ٹکڑا بھی مل گیا۔ ادھر سے فراغت ہوئی تو ڈائرکٹروں نے پرملا راتے سے درخواست کی کہ وہ انگلینڈ جا کر ضروری ساز و سامان خرید لائے۔

انگلینڈ جانے سے ایک روز پہلے پرفلا نے ٹھیٹ یورپی انداز میں لتیکا سے شادی کی درخواست کی جو اس نے فوراً منظور کر لی۔ چنانچہ اسی دن ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

دونوں انگلینڈ گئے۔ ہنی مون ہی دونوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک دوسرے کے جسم کے متعلق جو انکشافات ہونے تھے۔ وہ عرصہ ہوا ان پر ہو چکے تھے، ان کو اب دھن صرف اس بات کی تھی کہ وہ کمپنی جو انہوں نے قائم کی ہے اس کے لئے مشینری خریدیں اور واپس بمبئی میں جا کر کام پر لگ جائیں۔

لتیکا نے کبھی اس کے متعلق نہ سوچا تھا کہ پرفلا جو فلم سازی سے قطعاً ناواقف ہے۔ اسٹوڈیو کیسے چلائے گا۔ اس کو اس کی ذہانت کا علم تھا۔ جس طرح اس نے خاموشی ہی خاموشی میں صرف اپنی خلا میں دیکھنے والی آنکھوں سے اس کی نوک پلک درست کر دی تھی۔ اسی طرح اس کو یقین تھا کہ وہ فلم سازی میں بھی کامیاب ہوگا۔ وہ اس کو جب اپنے پہلے فلم میں ہیروئن بنا کر پیش کرے گا تو ہندوستان میں ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔

پرفلا رائے فلم سازی کی تکنیک سے قطعاً ناآشنا تھا۔ جرمنی میں صرف چند دن اس نے اوفا اسٹوڈیوز میں اس صنعت کا سرسری مطالعہ کیا تھا لیکن جب وہ انگلینڈ سے اپنے ساتھ ایک کیمرہ مین اور ایک ڈائرکٹر لے کر آیا اور انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا پہلا فلم سیٹ پر گیا تو اسٹوڈیوز کے سارے عملے پر اس کی

ذہانت اور قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ بہت کم گفتگو کرتا تھا۔ صبح سویرے اسٹوڈیو آتا تھا اور سارا دن اپنے دفتر میں فلم کے مناظر اور مکالمے تیار کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ شوٹنگ کا ایک پروگرام مرتب تھا جس کے مطابق کام ہوتا تھا۔ ہر شعبے کا ایک نگران مقرر تھا جو ہمانشو رائے کی ہدایت کے مطابق چلتا تھا۔ اسٹوڈیو میں ہر قسم کی آوارگی ممنوع تھی۔ بہت صاف ستھرا ماحول تھا جس میں ہر کام بڑے سلیقے سے ہوتا تھا۔

پہلا فلم تیار ہو کر مارکیٹ میں آگیا۔ ہمانشو رائے کی فلم میں دیکھنے والوں نے وہ کچھ دیکھا جو دیکھنا چاہتا تھا وہی پردے پر پیش کیا تھا۔ وہ زمانہ بھڑکیلے پن کا تھا۔ ہیروئن وہی سمجھی جاتی تھی جو زرق برق کپڑوں میں ملبوس ہو، اونچی سوسائٹی سے متعلق ہو۔ ایسے رومانوں میں مبتلا ہو جو حقیقت سے کہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ایسی زبان بولے جو اسٹیج کے ڈراموں میں بولی جاتی ہے۔ لیکن ہمانشو رائے کے پہلے فلم میں سب کچھ اس کا الٹ تھا۔ فلم بینوں کے لئے یہ تبدیلی، یہ اچھا لگتا تھا بڑا خوشگوار تھا چنانچہ یہ ہندوستان میں ہر جگہ کامیاب ہوا اور دیویکا رانی نے فلم کے دنیا میں فوراً ہی اپنا مقام پیدا کر لیا۔

ہمانشو رائے اس کامیابی پر بہت مطمئن تھا۔ وہ جب دیویکا کے معصوم حسن اور اس کی بھولی بھالی اداکاری کے متعلق اخباروں میں پڑھتا تھا تو اس کو اس خیال سے کہ وہ اس کا خالق ہے بہت راحت پہنچتی تھی۔ لیکن دیویکا پر اس

کامیابی نے کوئی نمایاں اثر نہیں کیا تھا۔ اس کی اندازہ گیر طبیعت کے لیے یہ کوئی غیر متوقع چیز نہیں تھی۔ وہ کامیابیاں جو مستقبل کی کوکھ میں چھپی ہوئی تھیں کھلی ہوئی کتاب کے اوراق کی مانند اس کے سامنے تھیں۔

پہلے فلم کی نمائش عظمیٰ پر وہ کیسے کپڑے پہن کر سینما ہال میں جائے گی۔ اپنے خاوند پر فلا رائے سے دوسروں کے سامنے کس قسم کی گفتگو کرے گی۔ جب اسے ہار پہنائے جائیں گے تو وہ انہیں اتار کر خوش کرنے کے لئے کس کے گلے میں ڈالے گی۔ اس کے ہونٹوں کا کون سا کونہ کس وقت پر کس انداز میں مسکرائے گا یہ سب اس نے ایک مہینہ پہلے سوچ لیا تھا۔

اسٹوڈیو میں لیکا کی ہر حرکت ہر ادا ایک خاص پلان کے ماتحت عمل میں آتی تھی۔ اس کا مکان پاس ہی تھا۔ سر ہاورڈ جیسیکل کو پر فلا رائے نے اسٹوڈیو کے بالائی حصے میں جگہ دے رکھی تھی۔ لیکا صبح سویرے آتی اور کچھ وقت سر ہاورڈ کے ساتھ گذارتی جس کو باغبانی کا شوق تھا۔ نصف گھنٹے تک وہ اس بڈھے الکن نائٹ کے ساتھ پھولوں کے متعلق گفتگو کرتی رہتی۔ اس کے بعد گھر چلی جاتی اور اپنے خاوند سے اس کی ضروریات کے مطابق تھوڑا سا پیار کرتی۔ وہ اسٹوڈیو چلا جاتا اور لیکا اپنے سادہ میک اپ میں جس کا ایک ایک خط، ایک ایک نقطہ پر فلا کا بنایا ہوا تھا مصروف ہو جاتی۔

دوسرا فلم تیار ہوا، پھر تیسرا، اسی طرح پانچواں، یہ سب کامیاب ہوگئے

اتنے کامیاب کہ دوسرے فلم سازوں کو انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے قائم کردہ خطوط [illegible] چھپنا پڑا۔ اس نقل میں وہ کامیاب ہوئے یا ناکام، اس کے متعلق ہمیں کوئی سروکار نہیں ۔۔۔ لتیکا کی شہرت ہر نئے فلم کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ ہر جگہ انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا شہرہ تھا۔ مگر پرفلا رائے کو بہت کم آدمی جانتے تھے۔ وہ جو اس کا معمار تھا، وہ جو لتیکا کا نصف بہتر تھا۔ لیکن پرفلا نے کبھی اس کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا، اس کی خلا میں جھانکنے والی آنکھیں، ہر وقت سگریٹ کے دھوئیں میں لتیکا کے نت نئے روپ بدلنے میں مصروف رہتی تھیں۔

ان فلموں میں ہیرو کو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پرفلا رائے کے اشاروں پر وہ کہانی میں اٹھتا، بیٹھتا اور چلتا تھا۔ اسٹڈیو میں بھی اس کی شخصیت معمولی تھی۔ سب جانتے تھے کہ پہلا نمبر مسٹر رائے کا اور دوسرا مسز رائے کا، جو باقی ہیں سب فضول ہیں۔ لیکن اس کا ردعمل یہ شروع ہوا کہ ہیرو نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ لتیکا کے ساتھ اس کا نام پردے پر لازم و ملزوم ہو گیا تھا، اس لئے اس سے اس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ لتیکا سے اُسے دلی نفرت تھی، اس لئے کہ وہ اس کے حقوق کی پرواہ ہی نہیں کرتی تھی۔ اس کا اظہار بھی اس نے اب آہستہ آہستہ اسٹڈیو میں کرنا شروع کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اچانک پرفلا رائے نے اپنے آئندہ فلم میں اس کو شامل نہ کیا۔ اس پر چھوٹا سا ہنگامہ برپا ہوا لیکن

فوراً ہی دب گیا۔ نئے ہیرو کی آمد سے تھوڑی دیر اسٹوڈیو میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں، لیکن یہ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔

لیکا اپنے شوہر کے اس فیصلے سے متفق نہیں تھی لیکن اس نے اسے تبدیل کرانے کی کوشش نہ کی، جو حساب اس نے لگایا تھا اس کے مطابق تازہ فلم ناکام ثابت ہوا۔ اس کے بعد دوسرا بھی۔ اور جیسا کہ لیکا کو معلوم تھا، اس کی شہرت دبنے لگی اور ایک دن یہ سننے میں آیا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اخباروں میں ایک تھلکہ مچ گیا۔ لیکا کا نام حیرتناک طور پر رومانس سے غیر متعلق ہو گیا تھا۔ لوگوں نے جب سنا کہ وہ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ تو اس کے عشق کی کہانیاں گھڑنی شروع کر دیں۔

پرفلا رلئے کو بہت صدمہ ہوا جو اس کے قریب تھے ان کا بیان ہے کہ وہ کئی بار بے ہوش ہوا۔ لیکا کا بھاگ جانا اس کی زندگی کا بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس کا وجود اس کے لئے کینوس کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر وہ اپنے خوابوں کی تصویر کشی کرتا تھا۔ اب ایسا کینوا اسے اور کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتا تھا غم کے مارے وہ نڈھال ہو گیا اس نے کئی بار چاہا کہ اسٹوڈیو کو آگ لگا دے اور اس میں خود کو جھونک دے۔ مگر اس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت تھی جو اس میں نہیں تھی۔

آخر پرانا ہیرو آگے بڑھا اور اس نے معاملہ سلجھانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے لیکا کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ پرفلا بھونچکا رہ گیا۔ اس نے بتایا — "لیکا ایسی عورت ہے جو محبت کے لطیف

جذبے سے قطعاً محروم ہے۔ نئے ہیرو کے ساتھ وہ اس لئے نہیں بھاگی کہ اس کو اس سے عشق ہے۔ یہ محض اسٹنٹ ہے۔ ایک ایسی چال جس سے وہ اپنی تنزل پذیر شہرت کو تھوڑے عرصے کے لئے سنبھالا دینا چاہتی ہے اور اس میں اس نے اپنا شریک کار نئے ہیرو کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ میری طرح خود سر نہیں وہ اس کو اس طرح اپنے ساتھ لے گئی ہے جس طرح کسی نوکر کو لے جاتے ہیں۔ اگر اس نے مجھے منتخب کیا ہوتا تو اس کی اسکیم کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ میں کبھی اس کے احکام پر نہ چلتا۔ وہ اس وقت واپس آنے کے لئے تیار ہے، کیونکہ اس کے حساب کے مطابق اس کی واپسی میں بہت دن اوپر ہو گئے ہیں۔۔۔۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید میں یہ باتیں بھی اسی کے کہنے کے مطابق آپ کو بتا رہا ہوں۔"

دوسرے تخلیقی فن کاروں کی طرح پر غالا راستے بھی پہلے درجے کا سکی تھا پرانے ہیرو کی یہ باتیں فوراً ذہن میں بیٹھ گئیں، لیکن جب نتیکا واپس آئی تو اس نے عاشق صادق کے سے گلے شکوے شروع کر دیئے اور اس کو بیوفائی کا مجرم قرار دیا۔

نتیکا خاموش رہی۔ اس نے اپنی بے گناہی کے جواز میں کچھ نہ کہا۔ پرانے ہیرو نے اس کے متعلق جو باتیں اس کے شوہر سے کی تھیں، اس نے ان پر بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اس کے کہنے کے مطابق پرانے ہیرو کی تنخواہ دوگنی ہو گئی۔ اب وہ اس سے باتیں بھی کرتی تھی، لیکن ان کے درمیان وہ فاصلہ بدستور قائم

رہا جس کی حدود شروع ہی سے مقرر کر چکی تھی۔

فلم پھر کامیاب ہوا۔ جو اس کے بعد پیش ہوا اسے بھی کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن اس دوران میں انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے خطوط پر چل کر اور کئی ادارے فلم سازی کی نئی راہیں کھول چکے تھے۔ متعدد نئے چہرے جو لتیکا کے مقابلے میں کئی گنا پرکشش تھے، اسکرین پر پیش ہو چکے تھے۔ پرانے ہیرو کا خیال تھا کہ لتیکا ضرور اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی اور فلم ساز کی آغوش میں چلی جائے گی، جو اس کے وجود میں ننھے جزیرے دریافت کر سکے۔ لیکن بہت دیر تک کوئی قابلِ ذکر بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔

اسٹوڈیو میں لتیکا کے متعلق ہر روز مختلف باتیں ہوتی تھیں۔ سب یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ خاوند کے ساتھ اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔ ان کے بارے میں کئی روایتیں مشہور تھیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنے سائیں کے ساتھ خراب ہے۔ یہ روایت پرانے ہیرو سے تھی۔ اس کو یقین تھا کہ لتیکا اپنے سائیں رام بھروسے کے ذریعے سے اپنی جسمانی خواہشات پوری کرتی ہے اور اپنے خاوند پر غلط رائے سے اس کے تعلقات صرف نمائشی بستر تک محدود ہیں ـــــ!

پرانا ہیرو اپنے اس مفروضے کے جواز میں یہ کہتا تھا ـــــ لتیکا جیسی عورت اس قسم کے تعلقات صرف ادنےٰ قسم کے نوکر ہی سے پیدا کر سکتی ہے جو اس کے

اشاروں پر آئے اور اشاروں ہی پر چلا جائے۔ جس کی گردن اس کے احسان تلے دبی رہے ـــــ اگر وہ عشق و محبت کرنے کی اہلیت رکھتی تو نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ کر پھر واپس نہ آتی ـــــ یہ اس کا اسٹنٹ تھا اور اس کا پلاٹ مکمل ہو چکا ہے ـــــ تم یقین مانو کہ اس کے دن لد چکے ہیں، اور وہ اسے جانتی ہے اور اچھی طرح سمجھتی ہے اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ مسٹر رائے کی تمام طاقتیں اسے بنانے اور سنوارنے میں ختم ہو چکی ہیں۔ اب وہ آم کی چسی ہوئی گٹھلی کے مانند ہے ـــــ اس میں وہ رس نہیں رہا جس سے وہ اتنی دیر امرت حاصل کرتی رہی تھی ـــــ تم دیکھ لینا، تھوڑے ہی عرصے کے بعد اپنی کایا کلپ کرانے کی خاطر وہ کسی اور فلم ساز کی آغوش میں چلی جائے گی۔"

لیکن لتیکا کسی اور فلم ساز کی آغوش میں نہ گئی! یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ موڑ اس کے ذاتی زندگی کے نقشے میں کہیں نہیں تھا۔ نئے ہیرو کے ساتھ بھاگ جانے کے بعد اس میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سر ہاورڈ ہیگ کی مانند صبح سویرے باغبانی کی طرف سے وہ اب بھی اسی طرح نظر آتی تھی۔ اسٹوڈیو میں اس کے بارے میں جو باتیں ہوتی تھیں، اس کے علم میں تھیں، مگر وہ خاموش رہتی تھی، اسی طرح پرمننٹ طور پر خاموش!

دو فلم اور بنے جو بہت بری طرح ناکام ہوئے۔ انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کا روشن نام مدھم پڑنے لگا۔ لتیکا پر اس کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا۔ مگر اسٹوڈیو کا ہر آدمی جانتا تھا کہ مسٹر رائے سخت پریشان ہیں۔ پرانے ہیرو نے جو اپنے آقا کی قدر کرتا تھا

اور اس کا ہمدرد بھی تھا۔ کئی بار اسے رائے دی کہ وہ کمپنی کے جھگڑوں سے الگ ہو جائے۔ فلم سازی کا کام اپنے شاگردوں کو سونپ دے اور خود آرام کی زندگی بسر کرنا شروع کر دے۔ مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ہمانسو ایک بار پھر اپنے خواب ساز دماغ کی منتشر اور مضمحل قوتیں مجتمع کرنا چاہتا ہے اور لیتیکا کے وجود کے ڈھیلے تانے بانے میں ایک نئے اور دل فریب خواب کے نقش ابھارنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

گھر کے نوکروں سے جو خبریں باہر آتی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ ہمانسو رائے کا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ ہر وقت جھنجھلایا رہتا ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر لیتیکا کو گندی گندی گالیاں بھی دیتا ہے۔ مگر وہ خاموش رہتی ہے۔ اگر کبھی مسٹر رائے کو شبہ ہو جاتا ہے کہ ان کی شکایت ہوئی ہے تو وہ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر دباتی ہے اور سہلا دیتی ہے۔

پہلے مسٹر رائے کبھی ادھر نہیں دیکھتے تھے کہ لیتیکا ان کے پاس ہے یا نہیں مگر اب وہ کئی بار نوکروں کو ڈھونڈنے بھیجتے تھے اور جب اس کو خبر دی جاتی تھی کہ وہ ان کے ساتھ سو سکے۔ پر اس نے پیرو کو جب اپنی باتیں معلوم ہوتی تھیں تو اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ "مسٹر رائے بہت بڑا آدمی ہے — لیکن افسوس کہ اس نے اپنا دماغ ایک ایسی عورت کے قدموں میں ڈال دیا جو کسی طرح بھی اس اعزاز کے قابل نہیں تھی — وہ عورت نہیں چڑیل ہے — میرے اختیار

میں ہو تو میں اسے گولی سے اڑا دوں! —— سب سے بڑی ٹریجیڈی تو یہ ہے کہ مسٹر رائے کو اب اس سے بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے۔"

جو زیادہ گہرائیوں میں اترنے والے تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ پرفلا رائے ہیں چونکہ اب لتیکا کو کوئی اور رنگ روپ دینے کی قوت باقی نہیں رہی، اس لئے وہ جھنجھلا کر اس کو خراب کر دینا چاہتا ہے۔ اب تک وہ اسے ایک مقدس چیز سمجھتا رہا تھا جس پر اس نے گندگی اور نجاست کا ایک ذرہ تک بھی نہیں گرنے دیا تھا۔ مگر اب وہ اسے ناپاک کر دینا چاہتا ہے، غلاظت میں لتھیڑ دینا چاہتا ہے، تاکہ جب وہ کسی کے منہ سے یہ سنے کہ تمہاری لتیکا کو ہم نے فلاں فلاں نجاست سے ملوث کیا ہے تو اسے زیادہ روحانی کوفت نہ ہو۔ وہ پہلے خوابوں کی نرم و نازک دنیا میں بستا تھا، اب حقیقت کے پتھروں کے ساتھ اپنا اور لتیکا کا سر پھوڑنا چاہتا ہے۔

وقت گزرتا گیا، انڈیا ٹاکیز لمیٹڈ کے بتیسویں فلم کی شوٹنگ جا رہی تھی، پرفلا رائے ایک بالکل نیا تجربہ کر رہا تھا۔ لیکن اسٹوڈیو میں آدمیوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس قسم کا ہے۔ رائے کے دفتر کی بتی رات کو دیر تک جلتی رہتی تھی۔ گھر جانے کے بجائے اب وہ اکثر وہیں سو جاتا تھا۔ کاغذوں کے انبار اس کی میز پہ لگے رہتے تھے۔ جب اس کی ایش ٹرے صاف کی جاتی تو جلے ہوئے سگریٹوں کا ایک ڈھیر نکلتا۔ کہانی لکھی جا رہی تھی، مگر کس نوعیت کی؟ اس کے سینریو ڈیپارٹمنٹ

کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔

درزی خانے کے لوگ قریب قریب بیکار تھے۔ ایک دن لتیکا وہاں موجود ہوئی اور اس نے اپنے لیے لمبی آستینوں والا سیاہ بلاؤز بنانے کا حکم دیا۔ کپڑا اس کی پسند کے مطابق آیا، ڈیزائن بھی اس نے خود منتخب کیا، اس کے ساتھ ہی اس نے سیاہ جارجٹ کی ساڑھی منگوائی۔ پھر ہیئر ڈریسر مس ڈی میلو سے اپنے نئے ہیئر اسٹائل کے متعلق مفصل بات چیت کی۔ یہ باتیں جب اسٹوڈیو میں عام ہوئیں تو لوگوں نے نئی فلم کے متعلق اپنی اپنی فکر کے مطابق اندازے لگائے۔ پرانے ہیرو کا یہ خیال تھا کہ مسٹر رائے شاید اپنی زندگی کی ٹریجیڈی پیش کریں گے۔ لیکن جب پہلی شوٹنگ کی اطلاع بورڈ پر لگی اور سیٹ پر کام شروع ہوا تو لوگوں کو بڑی ناامیدی ہوئی۔ وہی پرانا ماحول تھا، اور وہی پرانے ملبوسات۔

شوٹنگ حسب معمول بڑے ہموار طریقے پر جاری رہی، لیکن اچانک ایک دن اسٹوڈیو میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پرفلا رائے حسب معمول سیٹ پر موجود تھا۔ جونہی اس نے شوٹنگ دیکھی اور ایک دم کیمرہ مین پر برس پڑا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ زور کا تھپڑ اس کے کان پر جڑ دیا جس کے باعث وہ بے ہوش ہو گیا۔ پہلے تو اسٹوڈیو کے آدمی خاموش رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسٹر رائے پر دیوانگی طاری ہے تو انہوں نے مل کر اسے پکڑ لیا اسے گھر لے گئے۔

اچھے سے اچھے ڈاکٹر بلائے گئے مگر پرفلا رائے کی دیوانگی بڑھتی گئی دو۔

بار بار لتیکا کو اپنے پاس بلاتا تھا مگر جب وہ اس کی نظروں کے سامنے آتی تھی تو اس کا جوش بڑھ جاتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے نوچ ڈالے، اتنی گالیاں دیتا تھا، ایسے ایسے بُرے ناموں سے اسے یاد کرتا تھا کہ سننے والے حیرت زدہ ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگتے تھے۔

پورے چار دن تک پرفلا رائے پر دیوانگی طاری رہی۔ بہت خطرناک قسم کی دیوانگی۔ پانچویں روز صبح سویرے جب کہ لتیکا سرہاورڈ پیسکل کے ساتھ باغبانی میں مصروف تھی اور دبی دبی زبان میں اپنے خاوند کی افسوسناک بیماری کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے آخری سانس لے رہے ہیں۔ یہ سن کر لتیکا کو غش آ گیا۔ سرہاورڈ اور راشٹرپتی کے دوسرے آدمی ان کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ دوسری اطلاع پہنچی کہ مسٹر رائے سورگباش ہو گئے۔

دس بجے کے قریب جب لوگ ارتھی اٹھانے کے لئے کوٹھی پہنچے تو لتیکا غمزدہ تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بال پریشان تھے۔ سیاہ ساڑھی اور سیاہ بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ پرانے ہیرو نے اس کو دیکھا اور بڑی نفرت سے کہا۔

”کمبخت کو معلوم تھا کہ یہ سین کب شوٹ کیا جانے والا ہے۔۔۔“

نفسیاتی مطالعہ

مجھے چائے کے لئے کہہ کر، وہ اور اُن کے دوست پھر اپنی باتوں میں غرق ہو گئے۔

گفتگو کا موضوع، ترقی پسند ادب اور ترقی پسند ادیب تھا۔ شروع شروع میں تو یہ لوگ اردو کے افسانوی ادب پر طائرانہ نظر دوڑاتے رہے، لیکن پھر یہ نظر گہرائی اختیار کر گئی اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، گفتگو گرما گرم بحث میں تبدیل ہو گئی۔

میرے شوہر ترقی پسند تو نہ رجعت پسند، لیکن بحث پسند ضرور ہیں، چنانچہ اپنے دوستوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ گرمجوش وہی نظر آتے تھے۔ وہ اس اندیشے کے یکسر خلاف تھے کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کا مستقبل

تاریک ہے۔ بحث کے دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے بالکل "تم آج شام کو ساڑھی پہنو گی" کے سے فیصلہ کن انداز میں اپنے دوست حبیب سے کہا "تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک زندہ رہے گی"۔

حبیب صاحب فوراً سر تسلیم خم کر دینے والے نہیں تھے، چنانچہ بحث جاری رہی، اور جب میں چائے تیار کرنے کے لئے اٹھی تو حفیظ اللہ صاحب جن کو سب اُلّا کہہ کر پکارتے تھے پچیسواں سگریٹ پھونکتے ہوئے ترقی پسند ادب پر کریملین کے اشتمالی اثر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش شروع کرنے والے تھے۔

میں اٹھ کر باورچی خانے میں آئی تو نوکر غائب تھا اور چائے کا پانی چولہے پر دھرا بالکل غارت ہو چکا تھا۔ میں نے کیتلی کا پانی تبدیل کیا اور باہر نکل کر نوکر کو آواز دی۔ وہ جب آیا تو اس کے ہاتھ میں "اداکار" کا پرچہ تھا جس کے سرورق پر شنورما کی نیم برہنہ تصویر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے جھڑک کر پرچہ اس کے ہاتھ سے لیا۔ "جب دیکھو ادبیات پرچے پڑھ رہا ہے ــــ چائے کا پانی اُبل اُبل کر تیل بن چکا ہے اس کا کچھ خیال ہی نہیں ــــ جاؤ، پیسٹری لے کر آؤ ــــ منٹا منٹی میں آنا"۔

میں نے پرس میں سے ایک پانچ کا نوٹ اس کو دیا اور باورچی خانے میں لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر "اداکار" کی تصویریں دیکھنا شروع کر دیں۔ تصویریں دیکھ چکنے کے بعد میں سوال جواب پڑھ رہی تھی کہ پیسٹری آگئی۔ "اداکار" کا پرچہ میز پر رکھ کر میں نے سب والے الگ الگ طشتریوں میں چنے اور نوکر سے یہ کہہ کر وہ دودھ گرم کر کے

جلدی چائے لے آئے۔ واپس بڑے کمرے میں چلی آئی۔

جب اندر داخل ہوئی تو وہ اور ان کے دوست قریب قریب خاموش بیٹھے تھے۔ میں سمجھی شاید ان کی گفتگو ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ملّا صاحب نے اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک اتار کر رومال سے آنکھیں صاف کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھابی جان سے پوچھنا چاہیئے ۔۔۔ شاید وہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں؟"

میں کرسی پر بیٹھنے والی تھی۔ یہ سن کر قدرے رک گئی۔ اب حبیب صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "تشریف رکھئے!"

میں بیٹھ گئی۔ میرے شوہر اپنی جگہ سے اٹھے اور بالکل "اس کو سینا پرونا نہیں آتا" کے سے انداز میں اپنے دوست ملّا سے کہا "یہ اس معاملے پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی"۔

"پوچھنا مجھے تھا" حبیب صاحب نے ان سے پوچھا "کیوں؟"

حسبِ عادت میرے شوہر گول کر گئے "بس ۔۔۔۔!" پھر مجھ سے مخاطب ہو کے "چائے کب آئے گی؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا "جب آپ مجھ سے روشنی ڈالنے کے لئے کہیں گے"۔

ملّا صاحب نے چشمہ ناک پر جمایا اور تھوڑا سا مسکرائے "بات یہ ہے بھابی جان کہ ۔۔۔۔ وہ ہیں نا آپ کی ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔۔"

حبیب صاحب نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اُف، خدا کی قسم تمہیں اپنا مطلب سمجھانے کا سلیقہ کبھی نہیں آئے گا"۔ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "آپ یہ فرمائیے کہ آپ کا اپنی سہیلی بلقیس جہاں کے متعلق کیا خیال ہے؟"
سوال بڑا اوندھا سا تھا۔ میں جواب سوچنے لگی۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"۔
مُلّا صاحب نے حبیب صاحب کی پسلیوں میں اپنی کہنی سے ایک ٹھونکا دیا "بھئی واللہ، اپنا مطلب واضح طور پر سمجھانے کا سلیقہ ایک فقط تمہیں ہی آتا ہے"۔
"خیر و یار۔" حبیب جھنجھلا گئے۔ انہوں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور جھنجھلاہٹ دور کرتے ہوئے مجھ سے کہا "ابھی ابھی بلقیس کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اردو کے موجودہ ادب میں اس خاتون کا جو رتبہ ہے ـــــ میرا مطلب ہے کہ ان کا ایک خاص مقام ہے۔ افسانہ نگاری میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں وہ بہت آگے ہیں ـــــ جہاں تک نفسیات کے مطالعے کا تعلق ہے . . . ."
حبیب صاحب جیسے یہ کہنے کے لئے بیتاب تھے "اُن کا مطالعہ بہت گہرا ہے"۔
"خاص طور پر مردوں کی جنسی نفسیات کا"۔ میرے شوہر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے
مُلّا صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر میرے شوہر کے الفاظ دہرائے۔ "جی ہاں

خاص طور پر مردوں کی جنسی نفسیات کا؟" اور یہ کہتے ہوئے وہ دفعتہً محجوب سے ہو گئے اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ مجھے اُن پر کچھ ترس آیا چنانچہ میں نے ذرا بیباکی سے کہا "آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

مُلّا صاحب خاموش رہے۔ ان کی جگہ حبیب بولے "چونکہ آپ بلقیس صاحبہ کی سہیلی ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ آپ اُن کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔"

میں نے صرف اتنا کہا "ایک حد تک!"

میرے شوہر نے کسی قدر بے چین ہو کر کہا "بیکار ہے ــ بالکل بیکار ہے ــ عورتیں راز کی باتیں نہیں بتایا کرتیں، خاص طور پر جب وہ خود ان کی اپنی صنف سے متعلق ہوں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "کیوں محترمہ، کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

میرا خیال ہے وہ ایک حد تک درست کہہ رہے تھے، لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں چائے آ گئی اور گفتگو تھوڑے عرصے کے لئے "چائے کتنی ــ دودھ کتنا ــ شکر کتنے چمچ" میں تبدیل ہو گئی۔

مُلّا صاحب پانچویں کریم رول کی کریم اپنے ہونٹوں پر سے چوستے ہوئے پھر بلقیس جہاں کی طرف لوٹے اور بلند آواز میں کہا "کچھ بھی ہو، یہ طے ہے کہ یہ محترمہ ہم مردوں کی جنسی نفسیات کو خوب سمجھتی ہے۔"

ان کا روئے سخن ہم سب کی طرف کم اور ساری دنیا کی طرف زیادہ تھا۔ میں

ان کا یہ فیصلہ سن کر دل ہی دل میں مسکرائی۔ کیونکہ مرحومہ بلقیس اُلّا صاحب کی جنسی نفسیات خوب سمجھتی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا "بھیّو۔ اگر یہ اُلّا صاحب تمہارے شوہر نیک اختر کے دوست نہ ہوتے تو خدا کی قسم میں انہیں ایسے چکر دیتی کہ ساری عمر یاد رکھتے ۔ اوّل درجہ کے ریشہ خطمی انسان ہیں ۔ ایٹیم لائنڈ عاشق۔"

مجھے معلوم نہیں بلقیس نے اُلّا صاحب کے متعلق یہ رائے کیسے قائم کی تھی۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں گدلی گدلی سی ہو رہی تھیں ــــ اسٹریم لائنڈ عاشق کا کوئی خط مجھے ان کے چہرے پر نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا ایسے معاملے جانچنے کے لئے ایک خاص قسم کی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو قدرت نے صرف بلی ہی کو عطا کی تھی۔

اُلّا صاحب نے جب مجھے گھورتے دیکھا تو سٹپٹا سے گئے۔ چھٹے کریم رول کی کریم بہت بری طرح ان کے ہونٹوں سے لتھڑ گئی "معاف کیجئے گا" یہ کہہ کر رومال سے اپنا منہ پونچھا "کیا آپ کی سہیلی بلقیس کے بارے میں میرا خیال غلط ہے"

میں نے اپنے لئے دوسرا کپ بنانا شروع کر دیا "میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی"

میرے شوہر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور بالکل "شلجم بن جلائے تم کبھی نہیں پکا سکتیں" کے سے انداز میں کہا "یہ اس بارے میں کبھی کچھ کہہ نہیں سکیں گی"

میں نے غیر ارادی طور پر ان کی طرف دیکھا۔ بی بی ان کے بارے میں یہ رائے تھی کہ ہنستے ہنستے پھنسنے کے فن میں بڑی مہارت حاصل کر گئے ہیں — بے حد خشک ہیں اور یہ خشکی انہوں نے اپنے وجود میں ادھر ادھر سے طلب ڈال کر پیدا کی ہے بظاہر کسی عورت میں دلچسپی ظاہر نہیں کریں گے مگر ہر عورت کو ایک بار چور نظر سے ضرور دیکھیں گے — دفعتاً انہوں نے میری طرف چور نظر سے دیکھا۔ میں جھینپ گئی۔

الٰہ صاحب اپنے ہونٹ تسلی بخش طور پر صاف کر چکے تھے۔ ایک پیٹیس اٹھا کر وہ میرے شوہر سے مخاطب ہوئے "یار تمہاری بیگم صاحبہ نے تو ہمیں بہت بُری طرح ڈس اپائنٹ کیا ہے"

حبیب صاحب چائے کا آخری گھونٹ پی کر بولے "درست ہے — لیکن اس معاملے میں بیوی کے بجائے خاوند کسی حد تک رہبری کر سکتا ہے"

الٰہ صاحب نے پوچھا "تمہارا مطلب ہے، بلقیس صاحبہ کے بارے میں؟"

"جی ہاں" یہ کہہ کر حبیب صاحب اُٹھے، میرے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے "اپنی بیگم صاحبہ کے ذریعے سے آپ کو بلقیس کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو ضرور معلوم ہوا ہوگا"

میرے شوہر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "صرف اسی قدر کہ اس کا مطالعہ کتابی نہیں ہے — یہ کہہ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا "کیوں سعیدہ؟"

میں نے ذرا توقف کے بعد کہا" جی ہاں ـــــ اسے کتابوں کے مطالعے کا اتنا شوق نہیں!"

میرے شوہر نے ایک دم سوال کیا "تم اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟"

مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں تھی، اس لئے میں نے اپنی معذوری ظاہر کردی لیکن میں سوچنے لگی کہ جب طلعت کا کام ہی لکھنا ہے، پھر اسے پڑھنے سے لگاؤ کیوں نہیں ـــــ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ نمائش میں گھومتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا" بھیتو، یہ نمائش نہیں ایک لائبریری ہے ـــــ زندہ اور متحرک کتابوں سے بھری ہوئی ـــــ غور تو کرو کتنے دلچسپ کردار چل پھر رہے ہیں۔"

سوچتے سوچتے مجھے اس کی اور بہت سی باتیں یاد آگئیں۔ عورتوں کے مقابلے میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ تپاک سے ملتی اور باتیں کرتی تھی، لیکن گفتگو کا موضوع ادب، شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، میرا خیال ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے ہر اس سے مل کر یقینی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہوں گے کہ بہت غیرادبی قسم کی عورت ہے، کیونکہ عام طور پر وہ گفتگو کا رخ لٹریچر کی طرف آنے ہی نہیں دیتی تھی لیکن اس کے باوجود اس سے ملاقات کرنے والے بہت خوش خوش جاتے تھے کہ انہوں نے اتنی بڑی ادبی شخصیت کے ایک بالکل نئے اور نرالے پہلو کی جھلک دیکھ لی ہے ـ

جہاں تک میں سمجھتی ہوں، تی اپنی شخصیت کے اس بظاہر بالکل نئے اور

نرالے پہلو کی جھلک خود دکھاتی تھی، بقدرِ ضرورت اور وہ بھی صرف اپنے ملاقاتیوں کے کردار کی صحیح جھلک دیکھنے کے لئے۔ میرے ساتھ اس کو اپنا یہ مجرب اور مجرب نسخہ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی کیونکہ بقول اس کے "میں نے ایک نظر ہی میں تاڑ لیا تھا کہ تم بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی ہو۔"

میں نرے بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی تو نہیں ہوں۔ لیکن شاید بلی نے یہ رائے اس لئے قائم کی تھی کہ میں نے اس کی بحث پسند، ضدی اور اڑیل طبیعت کے پیشِ نظر اس سے راہ و رسم بڑھانے سے پہلے ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کی طبیعت کے خلاف بالکل نہ چلوں گی۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے بعض افسانے جو بڑے خبیث قسم کے جنسیاتی یا نفسیاتی ہوتے تھے، میری سمجھ سے عام طور پر اونچے ہی رہتے تھے۔ وہ اکثر ایسے افسانوں کے متعلق پوچھا کرتی تھی "کہو، بھینو، تم نے میرا فلاں افسانہ پڑھا؟" اور پھر خود ہی کہا کرتی تھی "پڑھا تو ضرور ہو گا، مگر سمجھ میں کیا آیا ہو گا — خاک — خدا کی قسم تم بے حد سادہ اور چغد قسم کی لڑکی ہو!"

میں یہ افسانے سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی، مگر مجھے اس بات سے بڑی الجھن ہوتی کہ بلی عورت ہو کر ایسی گہرائیوں میں کود جاتی ہے، جن میں اترنے سے مرد بھی گھبراتے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ اس سے کہا "تم کیوں ایسی باتیں لکھتی ہو کہ مرد بیٹھ کر تمہارے متعلق طرح طرح کی افواہیں اڑاتے ہیں"۔ مگر اس نے ہر بار جواب کچھ اسی قسم کا دیا "اڑانے دو — میں ان کیڑوں کی کیا پروا کرتی ہوں — ایسی

درگت بناؤں گی کہ یاد رکھیں گے"!

وہ کتنے مردوں کی درگت بنا چکی تھی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں، لیکن یہ پتہ ہے ایک ادھیڑ عمر کے شاعر جو دو سال تک اسے عشقیہ خط لکھتے رہے تھے اور جیسے وہ دو [illegible] بس ہی شہ دیتی رہی تھی، انجام کار سب کچھ بھول کر ایک بہت ہی خفیہ خط میں اس کو اپنی بیٹی بنانے پہ مجبور ہو گئے تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ مجبور کر دیئے گئے تھے ۔۔۔ اس نے مجھے ان کا آخری خط دکھایا تھا ۔۔۔ خدا کی قسم مجھے بہت ترس آیا تھا بیچارے پر۔

ابا صاحب دوسرا پیگ ختم کر چکے تھے ۔۔۔ حبیب صاحب قہوے کا خالی پیالہ ہاتھ میں تھامے بیٹھے تھے۔ میں اٹھ کر چائے کے برتن جمع کرنے لگی تو ابا صاحب نے رسمیہ طور پر کہا۔ "اتنی لذیذ چائے کا بہت بہت شکریہ ۔۔۔ مگر یہ گلہ آپ سے ضرور رہے گا کہ آپ نے بلقیس بیگم صاحبہ کی جنسیات نگاری پر کوئی روشنی نہ ڈالی ۔۔۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بڑے بڑے ماہر جنسیات بھی حیران ہیں کہ ایک عورت میں اتنی گہری نگاہ کہاں سے آ گئی"۔

ذرا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی، میرے شوہر نے ریسیور اٹھایا: "ہلو ۔۔۔ ہلو ۔۔۔ جی ہ ۔۔۔ جی جی ۔۔۔ آداب عرض ۔۔۔ جی ہاں ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھ سے کہا "تمہارا فون ہے"۔ پھر جیسے دفعتہً یاد آیا ہو، "بلی ہے!"

"اُلّا صاحب، جنیت اور میں بیک وقت بولے" بلقیس!"

میں نے بڑھ کر رسیور رکھ دیا۔ گو بلقیس آنگن سے اوجھل تھی، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ جانتی ہے کہ اس کے متعلق یہاں باتیں ہو رہی تھیں ——— اس احساس کے باعث میں بوکھلا گئی۔ جلدی جلدی میں نے اس سے چند باتیں کیں اور ریسیور رکھ دیا ——— اس نے مجھے اپنے یہاں بلایا تھا۔

منگل بھی یہی ——— میں گھر کے کام کاج سے جلدی جلدی فارغ ہو کر بلی کے ہاں روانہ ہو گئی۔ کوٹھی کے باہر بے شمار اسباب افراتفری کے عالم میں پڑا تھا، اس لئے کہ سفیدی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی مگر اس کا سامان بھی درہم برہم تھا۔ میں ایک کرسی صاف کر کے اس پر بیٹھ گئی۔ بلی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھ سے کہا "میں ابھی آئی"

چند منٹ کے بعد ہی وہ واپس آ گئی اور مجھ سے کچھ دور اسٹول پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے کہا "آج تمہارے متعلق بہت باتیں ہو رہی تھیں!"

"اوہ! اس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔

"اُلّا صاحب بھی تھے"

"اچھا!"

میں نے انہیں بہت غور سے دیکھا مگر مجھے ان میں مسٹر لائیڈ عاشق کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

بلقیس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی، پھر بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا: "مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔"

"کیا؟"

"کوئی ایسی خاص نہیں۔"

لیکن اس کے لہجے نے چغلی کھائی کہ بات بہت خاص قسم کی ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً سوچا کہ اس کے لئے خاص بات صرف ایک ہی ہو سکتی ہے — کسی مرد کے عشق میں گرفتار ہو جانا۔ "آنکھ لڑ گئی کسی سے ہے؟"

بلقیس نے میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا — میں نے جب اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ مجھے بہت ہی متردد نظر آئی۔ "بات کیا ہے — آج تم میں وہ شگفتگی نہیں۔"

اس نے پھر مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ "شگفتگی؟ — نہیں تو۔ منگنی ہو رہی ہے نا۔ ساری پریشانی اسی کی ہے۔" یہ کہہ کر وہ دانتوں سے اپنے ناخن کاٹنے لگی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کیونکہ وہ اس عادت سے ہمیشہ بچی رہتی تھی۔

چند لمحات خاموشی میں گزر گئے — میں سوچ رہی تھی کہ وہ جلدی بات کرے لیکن وہ خدا معلوم کن خیالات میں غرق تھی۔ بالآخر میں نے تنگ آ کر اس سے کہا: "کیا تم پھر نفسیاتی مطالعہ شروع کر رہی ہو — آخر کچھ کہو گی یا نہیں؟"

وہ بڑبڑائی: "نفسیاتی مطالعہ..." اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو

گرنے لگے۔

میں ابھی اپنے تعجب کا اظہار بھی نہ کرنے پائی تھی کہ وہ اٹھ کر تیزی سے غسل خانے میں چلی گئی۔

بلی کی سی مسخر اڑانے والی آنکھیں اور آنسو ۔۔۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا مگر اس کا رونا نہایت کرب آلود تھا اور کچھ میری سمجھ میں نہ آیا۔ سینے کے ساتھ لگا کر اسے کچھ ڈھارس دی اور کہا "کیا بات ہے میری جان؟"

اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یک دم آنسو رک گئے۔ مجھ سے دور ہٹ کر وہ دریچے سے باہر دیکھنے لگی۔ "میں جانتی تھی کہ یہ کھیل خطرناک ہے۔ لیکن میں نے کوئی پروا نہ کی ۔۔۔ کیا دلچسپ اور مزیدار کھیل تھا!" وہ دیوانوں کی طرح ہنسی۔ "بہت ہی مزیدار کھیل ۔۔۔ ان کی فطری کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا، چند روز بے وقوف بنایا اور ایک افسانہ لکھ دیا ۔۔۔ کس کا افسانہ ہے ۔۔۔ نفیس جمال کا ۔۔۔ جنسی نفسیات کی ماہر کا ۔۔۔"

اس نے پھر رونا شروع کر دیا اور مجھ سے لپٹ کر کہنے لگی "دیکھو ۔۔۔ میری حالت قابلِ رحم ہے!"

"کیا ہوا میری جان؟"

مجھ سے دور ہٹ کر وہ پھر دریچے سے باہر دیکھنے لگی: "نفیس جمال کا نام ۔۔۔ قتل اسی کمرے میں اس کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔"

"کیسے؟"

"یہ مجھ سے نہ پوچھو بیبو"۔ یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ "لیکن نہیں۔۔ میں تم سے نہیں چھپا سکتی۔۔۔ سنو۔۔۔ چند دنوں سے میں سفیدی کرنے والے مزدور کا مطالعہ کر رہی تھی ــــ کل شام اس وحشی نے اچانک۔۔۔"

بلقیس نے دھکا دے کر مجھے باہر نکال دیا اور غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

جب میں گھر پہنچی تو اُلّا صاحب اور حبیب صاحب کے علاوہ اور صاحب بھی موجود تھے ــــ بلقیس جہاں کی حیرت انگیز جنسی نفسیات نگاری گفتگو کا موضوع تھا۔

موتری

کانگرس ہاؤس اور جناح ہال سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پیشاب گاہ ہے جسے بمبئی میں "موتری" کہتے ہیں۔ آس پاس کے محلوں کی ساری غلاظت اس تعفن بھری کوٹھڑی کے باہر ڈھیریوں کی صورت میں پڑی رہتی ہے۔ اس قدر بدبو ہوتی ہے کہ آدمیوں کو ناک پہ رومال رکھ کر بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔

اس موتری میں ایک دفعہ اسے مجبوراً جانا پڑا ۔۔۔ پیشاب کرنے کے لیے ناک پر رومال رکھ کر، سانس بند کر کے، وہ بدبوؤں کے اس مسکن میں داخل ہوا فرش پر غلاظت بلبلے بن بن کر پھٹ رہی تھی ۔۔۔ دیواروں پہ اعضائے تناسل کی مہیب تصویریں بنی تھیں ۔۔۔ سامنے کوئلے کے ساتھ کسی نے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا"

ان الفاظ نے بدبو کی شدت اور بھی زیادہ کر دی۔ وہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔

جناح ہال اور کانگرس ہاؤس دونوں پر گورنمنٹ کا قبضہ ہے۔ لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر جو موتری ہے، اسی طرح آزاد ہے۔ اپنی غلاظتیں اور عفونتیں پھیلانے کے لیے ـــــ آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب کچھ زیادہ ہی ڈھیریوں کی صورت میں باہر پڑا دکھائی دیتا ہے۔

ایک بار پھر اسے مجبوراً اس موتری میں جانا پڑا۔ ظاہر ہے کہ پیشاب کرنے کے لیے۔ ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ بدبوؤں کے اس گھر میں داخل ہوا ـــــ فرش پر پچھلے پاخانے کی پیپڑیاں جم رہی تھیں۔ دیواروں پر انسان کے اولاد پیدا کرنے والے اعضا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا ـــــ "مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا" کے نیچے کسی نے موٹی پنسل سے یہ گندے الفاظ تحریر کیے ہوئے تھے۔

"ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا"

اس تحریر نے موتری کی بدبو میں ایک تیزابی کیفیت پیدا کر دی ـــــ وہ جلدی جلدی باہر نکل آیا۔

مہاتما گاندھی کی غیر مشروط رہائی ہوئی۔ جناح کو پنجاب میں شکست ہوئی۔ جناح ہال اور کانگرس ہاؤس دونوں کو شکست ہوئی نہ رہائی۔ ان پر گورنمنٹ کا اور اس کے تھوڑے ہی فاصلے پر جو موتری ہے اس پر بدبو کا قبضہ جاری رہا ہے۔ آس پاس کے محلوں کا کوڑا کرکٹ اب ایک ڈھیر کی صورت میں باہر پڑا رہتا ہے۔

تیسری بار پھر اسے اس موتری میں جانا پڑا۔ پیشاب کرنے کے لیے نہیں۔ ناک پر رومال رکھ کر اور سانس بند کر کے وہ غلاظتوں کی اس کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ فرش پر کیڑے چل رہے تھے۔ دیواروں پر انسان کے شرمناک حصوں کی نقاشی کرنے کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ "مسلمانوں کی بہن کا پاکستان مارا" اور "ہندوؤں کی ماں کا اکھنڈ ہندوستان مارا" کے الفاظ دھندلے پڑ گئے تھے۔ مگر ان کے نیچے سفید چاک سے لکھے ہوئے یہ الفاظ ابھر رہے تھے۔

"دونوں کی ماں کا ہندوستان مارا"

ان الفاظ نے ایک لحظے کے لیے موتری کی بدبو غائب کر دی۔ جب آہستہ آہستہ باہر نکلا تو اسے یوں لگا کہ اسے بدبوؤں کے اس گھر میں ایک بے نام سی مہک آئی تھی صرف ایک لحظے کے لیے۔

(سنِ تصنیف ۱۹۴۵ء)

نُطفہ

معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کی شخصیت درحقیقت ایسی ہی تھی جیسی آپ نے افسانے میں پیش کی ہے، یا محض آپ کے دماغ کی پیداوار ہے، پر میں اتنا جانتا ہوں کہ ایسے عجیب و غریب آدمی عام ملتے ہیں — میں نے جب آپ کا افسانہ پڑھا تو میرا دماغ فوراً ہی اپنے ایک دوست کی طرف منتقل ہو گیا — صادقے کی طرف . . . . آپ کے بابو گوپی ناتھ اور ان میں بظاہر کوئی مماثلت نہیں ہے — لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے . . . آپ کے بابو گوپی ناتھ کو دولت وراثت میں ملی ہے۔ میرے صادقے کی اپنی محنت، مشقت اور ذہانت کے پھل ہیں۔ دونوں شاہ خرچ تھے۔ آپ کا بابو گوپی ناتھ بظاہر بدھو تھا، لیکن دراصل بہت ہوشیار

اور باخبر آدمی تھا۔ میرا صادق اندر باہر سے بالکل ایک جیسا تھا۔ وہ بدھو تھا نہ چالاک ــــ درمیانے درجے کی عقل و فہم کا آدمی تھا۔ اپنے کام میں آٹھوں گانٹھ ہوشیار، حساب کا پکا۔ لین دین کے معاملے میں بڑا با اصول۔ آپ کے بابو گوپی ناتھ کو لٹ جانے میں مزا آتا ہے۔ اُسے دوسروں کو لوٹنے میں۔ بابو صاحب کو پیروں فقیروں کے تکیوں اور رنڈیوں کے کوٹھوں سے رغبت تھی۔ صادق کو ان سے کبھی دلچسپی نہیں تھی ــــ مگر ان تمام تفاوتوں کے باوجود میں جب بھی بابو گوپی ناتھ کو صادق کے ساتھ کھڑا کرتا ہوں تو مجھے اُن کے خدوخال ایک جیسے نظر آتے ہیں جیسے دو جڑواں ہیں۔

میں تجزیہ نہیں کرنا جانتا ــــ ہو سکتا ہے آپ، جب صادق کا حال مجھ سے سُنیں تو اس کو انسانوں کی کسی اور ہی صنف میں کھڑا کر دیں جس میں بابو گوپی ناتھ کی مونچھ کا ایک بال بھی نہ آ سکتا ہو۔ لیکن میں یہی سمجھوں گا کہ آپ کے تجزیے میں غلطی ہوئی ہے اور میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اسے اس صنف سے نکال کر اس صنف میں شامل کر دیجئے جس میں آپ کا بابو گوپی ناتھ موجود ہے۔

آپ افسانہ نگار ہیں ــــ معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کے حالات آپ نے جوں کے توں بیان کئے ہیں یا اُن میں کچھ رد و بدل کیا ہے ــــ بہرحال جو کچھ بھی ہے بہت خوب ہے۔ اور جو کچھ اس افسانے میں ہے، اگر اس کے مطابق بابو گوپی ناتھ نہیں تھا تو لعنت ہے اس پر . . . اور اگر وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ افسانے میں

ہے تو اس پر خدا کی رحمت ہو ۔ ۔ ۔ یقین مانیے ایسے لوگ پرستش کے قابل ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور صادق کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات دلی میں ہوئی۔ جنگ کا زمانہ تھا ٹھیکیداریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ صادق کی پانچوں گھی میں تھیں اور سر محاورے کے مطابق کڑاہی میں۔ میل ملاپ اور اثر رسوخ کافی تھا اور شاہ خرچ تھا ہی۔ دس بیس پُر تکلف دعوتیں کرتا اور ایک کنٹریکٹ اپنی جیب میں ڈال لیتا۔

ایک بات ہے ــــ بے شک اس نے بہت کمایا ــــ دونوں ہاتھوں سے گورنمنٹ کا مال لوٹا۔ لیکن اس میں اس نے ان لوگوں کو برابر کا حصہ دیا جن کے ذریعے سے اس کو اس لوٹ کے مواقع بہم پہنچے تھے ــــ اسی دوران میں اس کا گذر ان وادیوں میں ہوا جن کا بابو گوپی ناتھ ایک بہت بڑا زائر تھا لیکن وہ ان میں بھٹکا نہیں۔ دوسروں کے ساتھ محض رواداری کی خاطر جاتا رہا اور واپس گھر آکر اپنے جوتوں کی گرد جھاڑ کر بیٹھ جاتا رہا۔ اس نے بوتل سے بھی تعارف حاصل کیا، مگر معانقے کی نوبت نہ آنے دی۔ ایک دو گھونٹ پئے۔ صرف دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے۔

ان کوٹھوں پر جہاں آپ کے بابو گوپی ناتھ کے قول کے مطابق دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے ــــ صادق نے خود کو دھوکا دینے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ایک دو بار اسے اپنے ساتھیوں کی خوشی کے لیے رنڈیوں کا منہ چومنا پڑا تھا

اور چند واہیات حرکتیں بھی کرنا پڑی تھیں۔ مگر اس نے ان سے کوئی لطف
حاصل نہیں کیا تھا۔

وہ رنڈی کے متعلق کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا — لیکن اگر ملٹری کے نوجوانوں
کے لئے رنڈیاں فراہم کرنے کا ٹھیکہ اسے مل جاتا تو وہ یقیناً ان کے متعلق بڑے
غور و فکر سے سوچنا شروع کر دیتا — وہ کاروباری آدمی تھا۔

لیکن ایک دم حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ صادق دس ہزاری نہ رہا
جنگ ختم ہوئی، ٹھیکے بھی ختم ہو گئے۔ پھر مقدموں کا کچھ ایسا تانا بانا بندھا کہ صادق
کچہریوں کے چکر میں پھنس گیا۔ جو دولت پیدا کی تھی، سب مقدموں کی نذر ہو گئی
موٹر کی بجائے اب صادق تانگے پر ہوتا تھا یا سائیکل پہ، پہلے نئے نئے سوٹ
اس کے بدن پر ہوتا تھا۔ اب اسے کپڑوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔

پہلے اس کے خوشامدی دوست اسے نواب صاحب کہہ کر پکارتے
تھے۔ اب وہ صرف "صادقا" — "اوئے صادقا" رہ گیا تھا۔ مگر ان کی اس
تبدیلی تخاطب کو صادق نے قطعاً محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کو اپنے مقدموں
کی اتنی فکر تھی کہ وہ ایسی فروعات کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

کچہریوں کے اس چکر میں اس نے اپنی مرضی سے بوتل کی طرف ہاتھ
بڑھایا اور تھوڑے ہی عرصے میں بڑے دھڑلے کا شرابی بن گیا — اسی
دوران میں اس کی ملاقات سرحد کے ایک خان سے ہوئی جس کو وہاں کی حکومت

نے صوبہ بدر کر رکھا تھا۔ یہ ملاقات رنڈی کے ایک کوٹھے پر ہوئی۔ زندگی میں صادق پہلی مرتبہ کسی انسان کے خلوص سے متاثر ہوا۔

یہ خان اپنے علاقے کا بہت بڑا رئیس تھا۔ بالکل ان پڑھ مگر جاہل نہیں تھا۔ اس کا دل و دماغ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے پوری طرح روشن تھا۔ وہ ایک بہت بڑا انقلاب چاہتا تھا جو ظلم و ستم کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ سرمائے کی لعنت سے دنیا آزاد ہو جائے ـــــ دنیا آزاد نہ ہو تو کم از کم اس کا صوبہ آزاد ہو جائے ـــــ ان خیالات کی پاداش میں وہ اپنے وطن سے باہر نکال دیا گیا تھا۔

میں آپ کی طرح افسانہ نگار نہیں ہوں۔ مجھ سے حاشیہ آرائی نہیں ہوتی ـــــ خان کا کیریکٹر بھی کم دلچسپ نہیں۔ کسی زمانے میں وہ بڑا پُرجوش سرخ پوش تھا۔ اس تحریک سے وابستہ ہو کر اس نے کئی مرتبہ جیل دیکھی۔ اپنی جائداد میں سے ہزاروں روپے خرچ کئے ـــــ جب بٹوارہ ہوا تو وہ مسلم لیگی بن گیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح سے اس کو والہانہ عشق ہو گیا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے اس نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں، لیکن پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ وہ جو تعلیم یافتہ تھے وہ اس سے آگے بڑھ گئے اور بڑے بڑے منصبوں پر جا بیٹھے ـــــ خان جھنجھلا گیا۔ اس جھنجھلاہٹ میں اس نے اپنے غیض و غضب کا بڑا خام مظاہرہ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا گیا۔

جس زمانے میں صادق کی ان سے ملاقات ہوئی، آپ کی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔ ان بچوں کی سی جن کو معمولی سی شرارت پر سخت گیر ماسٹر نے بنچ پر کھڑا کر دیا ہو یا مرغا بنا کر کلاس کے ایک کونے میں کان پکڑنے کا حکم دے دیا ہو ——

صادق جب بھی مجھ سے ان کی بات کرتا تو کہتا "بڑا بیبا آدمی ہے ——"

کچھ میں بھی اس خان کے متعلق جانتا ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ صرف "بیبا" ہی ایک ایسا لفظ ہے جو اس کی شخصیت کو پورے طور پر اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے —— وطن سے دور تھا سینکڑوں میل دور۔ مگر وطن کی یاد اسے کبھی نہیں ستاتی تھی —— اپنے گاؤں میں ایک چھوڑ دو بیویاں تھیں، مگر ان کے متعلق اس نے کبھی تردد کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ اس کو اس طرف سے کامل یقین تھا کہ زمینداری سے جو کچھ وصول ہوتا ہے، اُن کے اخراجات کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ سات آٹھ سو روپیہ ماہوار اس کا منیجر وہاں سے روانہ کر دیتا تھا۔ جو اس کی واکسہال موٹر کے پٹرول اور اس کی شراب پر اٹھ جاتا تھا۔

گھر اس کا ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے پر تھا۔ صوبہ بدر ہونے کے بعد اس نے کچھ دیر اس منڈی کے مختلف کوٹھوں پر جھک ماری۔ آخر کار ایک کوٹھا منتخب کر کے وہاں مستقل طور پر اپنے ڈیرے جما دیئے۔ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد خان صاحب کو محسوس ہوا کہ آپ کو اس کوٹھے کی رنڈی سے عشق ہو گیا ہے۔ آپ نے صادق کو اس راز سے بڑے بھولے پن کے ساتھ آگاہ کیا "صادق —— وہ رنڈی جس کے

کوٹھے پر تمہارے پہلی ملاقات ہوئی تھی ہمارے دل کے اندر گھس گئی ہے۔ . . .
اس کو نکالنے کی کوئی ترکیب تمہارے دماغ کے اندر آتی ہو تو ہم کو بتاؤ۔"
صادق نے اس کو بہت سی ترکیبیں بتائیں جن پر خاں صاحب نے عمل بھی کیا مگر وہ اپنے دل کے اندر سے اس رنڈی کو 'شہر بدر' نہ کر سکے۔ آخر کار انہوں نے ایک بار پھر اپنی پیپے پن کے ساتھ صادق سے کہا "صادق ___ وہ رنڈی ہم پر سوار ہو گئی ہے ___ ہم اس کو اپنی بیوی بنا لے گا۔"
صادق نے ان کو بہت سمجھایا بجھایا مگر خاں صاحب عشق کے ہاتھوں مجبور تھے۔ رنڈی کو بھی وہ پسند آ گئے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ میاں بیوی بن گئے
رنڈی کے گھر والوں کو یہ رشتہ بالکل پسند نہ آیا۔ بڑی گڑبڑ ہوئی۔ آخر سمجھوتہ ہو گیا ___ رنڈی وہیں کوٹھے پر رہی اور خاں صاحب اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنے لگے۔
صادق نے مجھ سے کہا "خان عجیب و غریب آدمی ہے ___ اتنے اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اخباری اور سیاسی دنیا میں نام رکھتا ہے، لیکن اسے کبھی اتنا خیال نہیں آتا کہ وہ ایک بدنام محلے میں رہتا ہے۔ ایک رنڈی جس کے ہزار ہا گاہک تھے، اس کی بیوی ہے ___ مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ پٹھان ہو کر اس کی غیرت کہاں سو رہی ہے ___ سرحد میں دو بیویاں پڑی ہیں۔ اولاد موجود ہے مگر وہ کس اطمینان سے ہیرا منڈی کے کوٹھے میں

ایک چھوڑی ہوئی ہڈی چوستا رہتا ہے ــ اس سے اس بارے میں کچھ کہتا ہوں تو اس کے بے ریا چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ مجھ سے کہتا ہے ــ صادق . . . . وہ لوگ ادھر راضی خوشی ہے . . . . ہمیں کوئی تردد نہیں . . . . اور یہ رنڈی بہت اچھا ہے . . . . ہم سے محبت کرتا ہے . . . . جو عورت اُدھر ہوتا ہے نا، محبت کرنا نہیں جانتا ــ ناز نخرہ نہیں جانتا . . . . اور مجھے یقین آجاتا ہے ــ مجھے اس کی ہر بات کا یقین آجاتا ہے "

اور یہ واقع ہے کہ صادق جس کو پہلے کسی بات کا یقین نہیں آتا تھا، اب اس خان کے کہنے پر چلتا تھا ــ جب وہ مقدموں سے فارغ ہوا۔ تو اس کے کہنے پر اس نے ٹھٹری کی چھوڑی ہوئی بارکیں ڈھانے اور ان کا ملبہ اٹھوانے کا ٹھیکہ لے لیا۔ اس کام سے اسے نفرت تھی، مگر خان صاحب کے مشورے کو وہ کیسے ٹال سکتا تھا، چنانچہ ایک برس تک وہ کمہاروں اور ان کے گدھوں اور ملبے کے دھول غبار میں پھنسا رہا۔ لیکن اس میں اس نے کافی کمایا۔

خوشامدی دوست یار، پھر اس کے گرد جمع ہو گئے ــ میرا خیال تھا کہ وہ انھیں منہ نہیں لگائے گا، لیکن اس نے ان کو دھتکارنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ پہلے صرف دسترخوان پر ان کی شمولیت ہوتی تھی۔ اب بوتل میں بھی وہ

اس کے شریک ہونے لگے۔ خان نے اس کو بتایا تھا کہ شراب بہت اچھی چیز ہے۔ خصوصاً اس آدمی کے لئے جو صوبہ بدر کر دیا گیا ہو۔ بوتل سے منہ لگتے ہی ایک نیا صوبہ اس کے دل و دماغ میں آباد ہو جاتا ہے۔ جس میں وہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک، جہاں چاہے اسٹول پر کھڑا ہو کے باغیانہ تقریر کر سکتا ہے۔ سرمائے کی تمام لعنتوں سے اس کو پاک کر سکتا ہے ——
اور پھر رنڈی کا کوٹھا . . . . اس سے بہترین گھر تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی گھریلو اور سگی قسم کی ہو تو آدمی اسے گالی نہیں دے سکتا۔ اگر رنڈی ہو تو گندی سے گندی گالی بھی اسے دی جا سکتی ہے —— اس کی ماں کے سامنے۔ اس کی پھوپھی کے سامنے۔ اس کی چچی کے سامنے —— اور اگر اس کا کوئی باپ موجود ہو تو اس کے بھی سامنے —— پھر وہ اسے اپنے مخصوص خام ادیبانہ انداز میں روزمرہ زندگی میں گالی کی اہمیت بیان کرنے لگتا اور اسے بتاتا کہ یہ بہت ضروری چیز ہے —— اگر آدمی اسے وقتاً فوقتاً اپنے اندر سے باہر نہ نکالے تو تعفن پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر دل و دماغ پر بہت برا اثر کرتا ہے —— رنڈی کا کوٹھا —— اور گھریلو گھر . . . زمین و آسمان کا فرق ہے —— وہاں سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اتنا سازوسامان اور اتنے رشتے ہوتے ہیں کہ آدمی ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو پوری زندگی اسی کوشش میں بسر ہو جائے مگر یہاں رنڈی کے کوٹھے پر ایسی کوئی مشکل نہیں —— اپنا ہولڈال اور ٹرنک

اٹھاؤ۔ اچکن کاندھے پر ڈالو اور کسی ہوٹل میں جا کر بڑے اطمینان سے طلاق کا کاغذ لکھ کر روانہ کر دو۔ ۔ ۔ ۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ رنڈی کو بیچنے میں اگر دقت محسوس ہو تو اس کو استعمال کرنے والے ایسے کئی آدمی موجود ہوں گے جن کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ پھر گانا بجانا مفت ـــ عیاشی کی عیاشی، شادی کی شادی ـــ جی اکتایا تو جھڑ کے چلتے بنے۔ ۔ ۔ ۔ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ کوئی برا نہیں کہے گا ـــ بلکہ وہ جو شریف ہیں مرحبا کہیں گے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا۔ ۔ ۔ ۔ رنڈی کو لعنتی کہیں گے جو چمٹ گئی تھی اور خداوند کریم کا شکر بجا لائیں گے کہ اس نے اس سے نجات دلائی ـــ اور رنڈی کی زندگی میں بھی کوئی زلزلہ نہیں آتا ـــ اس کے لگے بندھے گاہک موجود ہی ہوتے ہیں ـــ تمہاری ٹھیکے داری ختم ہوتی ہے تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں کہ چلو ہمارا راستہ کھلا۔"

صادق کو خان رنڈی سے شادی کے فائدے اکثر بتاتا رہتا تھا ـــ بوتل سے بڑے خلوص کے ساتھ منہ لگا کر اب اس نے رنڈیوں کے کوٹھوں پر بھی آنا جانا شروع کر دیا تھا ـــ مگر اس نے ان میں وہ بات ابھی تک نہیں دیکھی تھی جس کے متعلق وہ اکثر اپنے پٹھان دوست سے سنا کرتا تھا۔

خان کو صادق کے دل کا حال اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ وہ ہیرامنڈی سے اکتا گیا ہے۔ کاروبار اچھا ہے۔ آمدن کی معقول صورت

پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ اب اپنا گھر بنانا چاہتا ہے، جس میں اس کی
ایک عدد بیوی ہو۔ دس عدد بچے ہوں ــــ کلوٹ ہوں، پوتڑے ہوں، بچہ پیدا
ہو۔ چھتا ہو۔ توا ہو ــــ وہ چپل خرید لے تو سیدھا گھر پہنچے۔ شراب کی بوتلوں
کے بجائے، دودھ کی بوتلیں خریدے۔ میراثیوں اور بھڑووں کے بجائے
شریف شریف لوگوں سے ملے۔ شروع شروع میں تو خان اپنے مخصوص انداز
میں اسے ایسے واہیات اقدام سے روکنے کی نرم و نازک کوشش کرتا رہا۔
لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے محلے میں کسی سے کوئی مناسب و
موزوں رشتہ ڈھونڈنے کے لئے کہا ہے تو اس کو بہت کوفت ہوئی۔

"صادق ــــ یہ تم کیا حماقت کرنے والا ہے.... شادی وادی
ہرگز مت کرنا.... یہ دنیا ایسی ہے جہاں کسی وقت بھی تم کو صوبہ بدر یا
شہر بدر کر دیا جا سکتا ہے.... میں اتنے برس کانگریس میں رہا ہوں ــــ
سُرخ پوش تحریک چلانے میں اتنا کام میں نے کیا ہے کہ تم کو اس کا اندازہ
ہی نہیں ہو سکتا ــــ میں نے اپنی پولیٹیکل لائف میں صرف یہ سیکھا ہے۔ کہ
زندگی میں تم جس کو بھی شریک بناؤ، اٹیچی کیس کی طرح ہونی چاہیئے۔ جس کو تم ہاتھ
میں اٹھا کر چلتے بنو.... یا اسے وہیں چھوڑ دو ــــ وہ زیادہ قیمتی نہیں ہونی
چاہیئے.... قیمتی چیزوں کو چھوڑ دینے کا بڑا غم رہتا ہے.... سو برادر
تم شادی نہ کرو.... باز آؤ اس خیال سے.... وہ رنڈی جس کے پاس

تم جانتے ہو، کیا بری بات ہے — اس سے عشق کرنا شروع کردو — یہ کوئی مشکل کام نہیں — تھوڑی سی پریکٹس کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

صادق نے گھریلو قسم کی عورت سے شادی کے حق میں اپنے دلائل پیش کیے مگر خان کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چلی۔

"صادق، تم اُلو ہے — خدا کی قسم اُلو ہے۔ . . . تم ہماری بات نہیں مانتا جس کے پاس دو بیویاں ہیں۔ اپنے قبیلے کی — تم ہماری بات مانو — ہم تمہارا دوست ہے۔ پٹھان ہے۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بولتا — یہ دنیا جس میں ہم جیسے مخلص آدمی کو صوبہ بدر کرنے والے حاکم موجود ہیں، اس میں رنڈی کے کوٹھے ہی کو اپنا گھر بنانا چاہیئے — ہم کو تو یہاں بہت آرام ہے۔ . . . تم بھی ہیرا منڈی میں اپنا گھر بنا لو اور آرام کرو۔"

صادق عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ مجھ سے مل کر وہ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ وہ ہیرا منڈی کے سخت خلاف تھا مگر تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کا قائل ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ اب وہ خان کی کہی ہوئی باتیں یوں سناتا تھا جیسے اس کے دل کو لگ چکی ہیں۔ چنانچہ ایک روز اس نے مجھ سے کہا

"میں نے ساری عمر ٹھیکے داری کی ہے — اور ٹھیکے داری سے بڑھ کر بے ایمانی کا اور کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ اس کا اوّل جھوٹ، اس کا آخر

کھوٹ ــــ یہ ایسا بازار ہے جس میں کوئی کھرا سکہ نہیں چل سکتا ــــ سنا ہے ولایت میں ایسی مشینیں بنی ہیں جن میں اگر کھوٹے سکے ڈالے جائیں تو وہ باہر نکال دیتی ہیں ــــ لیکن ہمارے ہاں ایک ایسی مشین ہے جس میں اگر کھرے سکے ڈالے جائیں تو قبول نہیں کرے گی ــــ فوراً باہر نکال دے گی . . . مجھے ساری عمر یہی کاروبار کرنا ہے کہ مجھے صرف یہی آتا ہے . . . . تو کیوں نہیں ہیرا منڈی ہی میں اپنا گھر بناؤں ــــ وہاں کھرے سکے چلتے ہیں، لیکن ان کے عوض جو مال ملتا ہے اس میں صرف کھوٹ ہی کھوٹ ہوتا ہے . . . . میں سمجھتا ہوں، میری روحانی تسکین کے لئے وہاں کی فضا اچھی رہے گی"

پھر ایک روز اس نے مجھے بتایا "خان بہت خوش ہے ــــ اس کی دونوں بیویاں وہاں سرحد میں اس کے گھر میں خوش ہیں۔ اس کی اولاد بھی خوش ہے ــــ ان کی خیر خیریت اس کو اپنے مخبر کے ذریعے سے معلوم ہوتی رہتی ہے ــــ یہاں ہیرا منڈی میں اس کی رنڈی بھی خوش ہے ــــ اس کی ماں بھی خوش ہے۔ اس کی پھوپھی بھی خوش ہے، اس کے میراثی بھی خوش ہیں ــــ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ خان خوش ہے۔ کبھی کبھی ان خاکروں کے خلاف ایک بیان اخباروں میں شائع کر دیتا ہے جو پہلے اس کو صدمہ پہنچا کیا تھا اور اپنی رنڈی کو سنا دیتا ہے ــــ وہ بھی خوش ہو جاتی ہے ــــ اس رات گانے بجانے کی محفل گرم ہوتی ہے اور خان مسند پر گاؤ تکیے کا سہارا

ہے کہ یوں بیٹھتا ہے جس طرح ایک تماشبین ۔۔۔ استاد صاحب اور میراثیوں سے اس طرح باتیں کرتا ہے جیسے اس نے نئی نئی تماش بینی شروع کی ہے ۔۔۔ اس کی رنڈی مجرا کرتی ہے اور وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کو دس روپے کا نوٹ دیتا ہے پھر پانچ کا، پھر دو کا پھر ایک روپے والا ۔۔۔ اس کے بعد وہ محفل برخاست کر دیتا ہے اور اس رنڈی کے ساتھ سو جاتا ہے اور اس منکوحہ عورت کے ساتھ ایسی رات بسر کرتا ہے جو گناہ آلود ہو . . . میں تو سمجھتا ہوں، یہ بڑے مزے کی چیز ہے . . .

لیکن جب اس رنڈی سے شادی کا سوال پیدا ہوا، یعنی خان نے سب معاملہ تیار کر دیا اور صرف ایجاب و قبول کی رسم باقی رہ گئی تو صادق پیچھے ہٹ گیا۔ خان آگ بگولا ہو گیا۔ میرے سامنے اس نے صادق کو بہت لعن طعن کی۔

"تمہاری سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں صادق ۔۔۔ تم الو کے پٹھے ہو۔ شریف عورت سے شادی کر کے خدا کی قسم تم پچھتاؤ گے ۔۔۔ یہ دنیا ایسی نہیں ہے۔ پروردگار کی قسم جس میں شرافت سے شادی کی جائے ۔۔۔ اس میں رنڈی اچھی رہتی ہے ۔۔۔ تم شریف مت بنو۔ یاد رکھو اگر تم شریف بن گئے تو صوبہ بدر کر دیئے جاؤ گے ۔۔۔ تم ہیرا منڈی میں رہو۔ یہاں صرف یہی ایک صوبہ ہے جس میں سے تم بدر نہیں کئے جا سکتے اس لئے کہ اس کے ساتھ کوئی حاکم اپنا رشتہ قائم نہیں کرے گا ۔۔۔ تم گدھے ہو . . . اپنا گھر یہیں بناؤ . . . اس سے بہتر جگہ تمہیں اور کوئی نہیں مل سکتی۔"

صادق نے اپنے محلے میں ایک جگہ بات پکی کر لی تھی۔ جب خان نے اس کو سمجھایا بجھایا تو اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا، لیکن وہ رنڈی سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا: میں نے اب شادی کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے — میں خان کا کہنا ضرور مان لیتا مگر میرا دل نہیں مانتا — میں اب عیش کروں گا — ایک رنڈی کے پاس نہیں کئی رنڈیوں کے پاس جایا کروں گا۔"

اور اس نے متعدد رنڈیوں کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ اسے اب بہت سے ٹھیکے مل گئے تھے — اس کے پاس پھر دولت کی فراوانی تھی۔ ہیرا منڈی سے جب وہ موٹر میں گذرتا تو چاروں طرف کوٹھوں پر رنگین مسکراہٹیں تیتریوں کی طرح اڑنے لگتیں — اب وہ پھر نواب صاحب تھا — ہیرا منڈی کا نواب صاحب۔

پورے تین برس تک وہ کھل کھیلتا رہا۔ میرا خیال ہے، یہ فانا خان کی اس کوشش کا ردِ عمل تھا جو اس نے صادق کو اپنے قالب میں ڈھالنے کے سلسلے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے تجربات کا نچوڑ اس کے حلق میں ڈال کر اس کو اپنے جیسا بنا لے، مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صادق ادھر کا رہا نہ ادھر کا: وہ پورا اوباش بن گیا — جس رستے سے اس کو نفرت تھی — وہ اسی کا انتھک مسافر بن گیا۔

میں نے اس کو بارہا سمجھایا کہ دیکھو صادق باز آؤ۔ اپنی جوانی، اپنی صحت اور اپنی دولت یوں برباد نہ کرو۔ لیکن وہ نامراد میری باتیں سنتا اور مسکرا دیتا: میری دنیا، کھوٹ کی دنیا ہے۔ اس میں صرف ایک بٹا سو حصہ سیمنٹ ہوتا ہے، باقی

سب ریت ــــ اور وہ بھی جس میں آدھی مٹی ہوتی ہے ــــ میری ٹھیکہ داری میں جو عمارت بنتی ہے۔ اس کی عمر اگر کاغذ پر پچاس سال ہے تو زمین پر دس سال ہوتی ہے.... میں اپنے لئے پختہ گھر کیسے تعمیر کر سکتا ہوں.... رنڈیاں ٹھیک ہیں.... میں نے سوسائٹی کے اس ملبے کا بھی ٹھیکہ لے رکھا ہے ــــ ہر روز ایک نہ ایک بوری ڈھو کر ٹھکانے لگا دیتا ہوں"

وہ بوریاں ڈھو ڈھو کر اپنی دانست میں ٹھکانے لگاتا رہا ــــ میں نے اس سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ بہت بدنام ہو چکا تھا ــــ اس کو معلوم تھا کہ میں اس سے ناراض ہوں۔ لیکن اس نے مجھے منانے کی کوئی کوشش نہ کی۔

ڈیڑھ برس کے بعد ایک دن اچانک وہ میرے پاس آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہے مگر نہیں کہہ سکتا۔ میں نے اس سے پوچھا "کچھ کہنے آئے ہو؟"

اس نے جواب دیا "ہاں ــــ میں شادی کر رہا ہوں"

"کس سے؟"

"ایک رنڈی سے"

مجھے بہت غصہ آیا "بکو نہیں"

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میں مجبور ہو گیا ہوں"

میں چڑ گیا "مجبوری کیسی؟"

صادق نے سر جھکا کر کہا: "اس کے نطفہ ٹھہر گیا ہے۔"

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ اس سے کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ صادق نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کہنا شروع کیا: "میں مجبور ہو گیا ہوں ——— شادی کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں۔"

صادق نے اس رنڈی سے شادی کر لی ——— مگر اس کے کوٹھے کو اس نے اپنا گھر نہ بنایا ——— ان لوگوں نے، یہ رنڈی جن کی روزی کا ٹھیکہ تھی، بہت دنگا فساد کیا۔ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی۔ ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا دیئے اور آخر کامیاب ہو گیا ——— اس رنڈی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے چھ مہینے بعد صادق کے دل میں جانے کیا آئی کہ اس نے رنڈی کو طلاق دے دی اور اس سے کہا: "تمہارا اصل مقام یہ گھر نہیں ——— ہیرا منڈی ہے ——— جاؤ اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ ——— اس کو شریف بنا کر میں تم لوگوں کے کاروبار کے ساتھ ظلم کرنا نہیں چاہتا ——— میں خود کاروباری آدمی ہوں ——— یہ نکتے اچھی طرح سمجھتا ہوں ——— جاؤ، خدا میرے اس نطفے کے بھاگ اچھے کرے ——— لیکن دیکھو اسے نصیحت کرتی رہنا کہ کسی سے شادی کی غلطی کبھی نہ کرے ——— یہ غلط چیز ہے۔"

معلوم نہیں جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، صادق کے متعلق زیادہ ہے یا خان کے متعلق ——— بہر حال مجھے یہ دونوں اپنی جگہ کے آدمی معلوم ہوتے

ہیں جس میں آپ کا باپ گوپی ناتھ موجود ہے — اور اس دنیا میں جہاں صوبہ بدر اور شہر بدر کیا جا سکتا ہو، ایسے آدمی ضرور موجود ہونے چاہئیں جن کو سوسائٹی اپنے اور اپنے بنائے ہوئے قوانین کے منہ پر طمانچے کے طور پر کبھی کبھی مار سکے۔

سڑک کے کنارے

"یہی دن تھے ۔۔۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے ۔ دھلا ہوا، نتھرا ہوا ۔۔۔ اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی ۔۔۔ سہانے خوابوں کی طرح ۔ مٹی کی باس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت میرے دل و دماغ میں رچ رہی ہے ۔ ۔ ۔ اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی ۔"

"اس نے مجھ سے کہا تھا ۔ ۔ ۔ تم نے مجھے جو یہ لمحات عطا کئے ہیں یقین جانو ۔ میری زندگی ان سے خالی تھی ۔۔۔ جو خالی جگہیں تم نے آج میری ہستی میں پُر کی ہیں، تمہاری شکرگزار ہیں ۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید وہ ہمیشہ ادھوری رہتی ۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں تم سے اور کیا کہوں ۔ ۔ ۔

میری تکمیل ہو گئی ہے۔ ایسے مکمل طور پر کہ محسوس ہوتا ہے مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔۔۔ اور وہ چلا گیا۔۔۔ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔"

"میری آنکھیں روئیں۔۔۔ میرا دل رویا۔۔۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے لاکھ مرتبہ پوچھا کہ میری ضرورت اب تمہیں کیوں نہیں رہی۔۔۔ جبکہ تمہاری ضرورت۔۔۔ اپنی تمام شدتوں کے ساتھ اب شروع ہوئی ہے۔ ان لمحات کے بعد جنہوں نے بقول تمہارے، تمہاری ہستی کی خالی جگہیں پُر کی ہیں۔"

اس نے کہا: "تمہارے وجود کے جس جس ذرے کی میری ہستی کی تعمیر و تکمیل کو ضرورت تھی، یہ لمحات چن چن کر دیتے رہے۔۔۔ اب کہ تکمیل ہو گئی ہے تمہارا اور میرا رشتہ خود بخود ختم ہو گیا ہے۔"

"کس قدر ظالمانہ لفظ تھے۔۔۔ مجھ سے یہ پتھراؤ برداشت نہ کیا گیا۔۔۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگی۔۔۔ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔۔۔ میں نے اس سے کہا: "یہ ذرے جن سے تمہاری ہستی کی تکمیل ہوئی ہے، میرے وجود کا ایک حصہ تھے۔۔۔ کیا ان کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔۔۔ کیا میرے وجود کا بقایا حصہ ان سے اپنا ناطہ توڑ سکتا ہے؟۔۔۔ تم مکمل ہو گئے ہو۔۔۔ لیکن مجھے ادھورا کر کے۔۔۔ کیا میں نے اسی لئے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا؟"

اس نے کہا: "بھونرے، پھولوں اور کلیوں کا رس چوس چوس کر شہد کشید کرتے ہیں، مگر وہ اس کی مٹھاس تک بھی ان پھولوں اور کلیوں کے ہونٹوں

یک نہیں ملتے ۔۔۔ خدا اپنی پرستش کراتا ہے اگر خود بندگی نہیں کرتا۔۔۔۔
عدم کے ساتھ خلوت میں چند لمحات بسر کر کے اس نے وجود کی تکمیل کی۔۔۔۔
لیکن اب عدم کہاں ہے۔۔۔ اس کی اب وجود کو کیا ضرورت ہے۔
وہ ایک ایسی ماں تھی جو وجود کو جنم دیتے ہی زچگی کے بستر پر فنا ہو گئی تھی۔"
عورت رو سکتی ہے۔۔۔۔ دلیلیں پیش نہیں کر سکتی۔۔۔۔ اس کی
سب سے بڑی دلیل اس کی آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو ہے۔۔۔ میں نے اس سے
کہا "دیکھو۔۔۔ میں رو رہی ہوں۔۔۔ میری آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں
تم جا رہے ہو تو جاؤ۔ مگر ان میں سے کچھ آنسوؤں کو تو اپنے رومال کے کفن میں لپیٹ کر
ساتھ لیتے جاؤ۔۔۔ میں تو ساری عمر روتی رہوں گی۔۔۔ مجھے اتنا تو یاد رہے گا
کہ چند آنسوؤں کے کفن دفن کا سامان تم نے بھی کیا تھا۔۔۔ مجھے خوش
کرنے کے لئے!"

اس نے کہا "میں تمہیں خوش کر چکا ہوں۔۔۔ تمہیں اس ٹھوس مسرت
سے ہمکنار کر چکا ہوں جس کے تم سراب ہی دیکھا کرتی تھیں ۔۔ کیا اس کا لطف
اس کا کیف۔ تمہاری زندگی کے بقایا لمحات کا سہارا نہیں بن سکتا۔ تم کہتی ہو کہ
میری تکمیل نے تمہیں ادھورا کر دیا ہے ۔۔ لیکن یہ ادھورا پن ہی کیا تمہاری
زندگی کو متحرک رکھنے کے لئے کافی نہیں۔۔۔ میں مرد ہوں ۔۔ آج تم نے
میری تکمیل کی ہے۔۔۔ کل کوئی اور کرے گا۔۔۔ میرا وجود کچھ ایسے آب و گل

سے بنا ہے جس کی زندگی میں ایسے کئی لمحات آئیں گے جب وہ خود کو تشنۂ تکمیل سمجھے گا۔۔۔ اور تم ایسی کئی عورتیں آئیں گی جو ان لمحات کی پیدا کی ہوئی خالی جگہیں پُر کریں گی۔"

میں روتی رہی۔ جھنجھلاتی رہی۔

میں نے سوچا ـــ یہ چند لمحات جو ابھی ابھی میری مٹھی میں تھے۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ میں ان لمحات کی مٹھی میں تھی۔۔۔ میں نے کیوں خود کو ان کے حوالے کر دیا ـــ میں نے کیوں اپنی پھڑپھڑاتی روح ان کے منہ کھولے قفس میں ڈال دی۔۔۔ اس میں مزا تھا۔ ایک لطف تھا ـــ ایک کیف تھا۔۔۔ تھا، ضرور تھا۔۔۔ اور یہ اس کے اور میرے تصادم میں تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ کیا کہ وہ ثابت و سالم رہا۔۔۔ اور مجھ میں تریڑے پڑ گئے۔۔۔ یہ کیا، کہ وہ اب میری ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میں اور بھی شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں ـــ وہ طاقتور بن گیا ہے۔ میں نحیف ہو گئی ہوں ـــ یہ کیا کہ آسمان پہ دو بادل ہم آغوش ہوں ـــ ایک رو رو کر برسنے لگا، دوسرا بجلی کا کوندا بن کر اس بارش سے کھیلتا، کڑکڑے لگاتا بھاگ جائے۔۔۔ یہ کس کا قانون ہے؟ ـــ آسمانوں کا؟ ـــ زمینوں کا۔۔۔ یا ان کے بنانے والوں کا؟

میں سوچتی رہی اور جھنجھلاتی رہی۔

دو روحوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار

کرجانا — کیا یہ سب شاعری ہے؟ . . . . نہیں، دو روحیں سمٹ کر ضرور اس
ننھے سے نکتے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے . . . لیکن اس کائنات
میں ایک روح کیوں کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے . . . کیا اس قصور پر کہ اس
نے دوسری روح کو اس ننھے سے نکتے پر پہنچنے میں مدد دی تھی۔

یہ کیسی کائنات ہے۔

یہی دن تھے — آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج
ہے . . . اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی . . . اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے
اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی . . . وہ موجود نہیں ہے۔
. . . بجلی کا کوندا بن کر جانے وہ کن بدلیوں کی گریہ وزاری سے کھیل رہا ہے . . .
اپنی تکمیل کر کے چلا گیا . . . . . ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا . . . لیکن
اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے . . .
کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے؟

نہیں، نہیں . . . یہ کیسے تکمیل ہو سکتی ہے . . . یہ تو تخریب ہے . .
لیکن یہ میرے جسم کی خالی جگہیں کیوں پُر ہو رہی ہیں . . . . یہ جو گڑھے تھے
کس ملبے سے پُر کئے جا رہے ہیں . . . میری رگوں میں یہ کیسی سرسراہٹیں دوڑ
رہی ہیں — میں سمٹ کر اپنے پیٹ میں کسی ننھے سے نکتے پر پہنچنے کے لئے
پیچ و تاب کھا رہی ہوں . . . میری ناؤ ڈوب کر اب کن سمندروں میں ابھرنے

کس کے لئے اٹھ رہی ہے ....؟

یہ میرے اندر دبکتے ہوئے بلبلوں پر کس مہمان کے لئے دودھ گرم کیا جا رہا ہے ... یہ میرا دل میرے خون کو دھنک دھنک کر کس کے لئے نرم و نازک رضائیاں تیار کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے خیالات کے رنگ برنگ دھاگوں سے کس کے لئے ننھی منی پوشاکیں بن رہا ہے؟

میرا رنگ کس کے لئے نکھر رہا ہے ... میرے انگ انگ اور روم روم میں چھپی ہوئی ہچکیاں لوریوں میں کیوں تبدیل ہو رہی ہیں ....

یہی دن تھے — آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے .... لیکن یہ آسمان اپنی بلندیوں سے اتر کر کیوں میرے پیٹ میں تن گیا ہے ... اس کی نیلی نیلی آنکھیں کیوں میری رگوں میں دوڑتی پھرتی ہیں؟

میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں ایسی تقدیس کیوں آ رہی ہے؟

نہیں، نہیں ... یہ تقدیس کچھ بھی نہیں — میں ان محرابوں کو ڈھا دوں گی ... میں اپنے اندر تمام چولھے سرد کر دوں گی جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھتی ہیں — میں اپنے خیالات کے تمام رنگ برنگ دھاگے آپس میں الجھا دوں گی ....

یہی دن تھے — آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے ... لیکن میں وہ دن کیوں یاد کرتی ہوں جن کے سینے پر سے وہ اپنے نقشِ قدم بھی اٹھا کر لے گیا تھا ....

لیکن یہ ... یہ نقشِ قدم کس کا ہے — یہ جو میرے پیٹ کی گہرائیوں میں تڑپ رہا ہے ... یہ — کیا یہ میرا جانا پہچانا نہیں ....

میں اسے کھرچ دوں گی ... اسے مٹا دوں گی — یہ رسولی ہے — پھوڑا ہے — بہت خوفناک پھوڑا۔

لیکن مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پھایا ہے ... پھایا ہے تو کس زخم کا ہے — اس زخم کا جو وہ مجھے لگا کر چلا گیا تھا — نہیں نہیں — یہ تو ایسا لگتا ہے کسی نہ پیدا شدہ زخم کے لئے ہے ... ایسے زخم کے لئے جو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا ... جو میری زندگی میں جانے کب سے سو رہا تھا۔

یہ کچھ کیا ہے ... فضول سی مٹی کی ہنڈکلیا — بچوں کا کھلونا — میں اسے توڑ پھوڑ دوں گی۔

لیکن یہ کون میرے کان میں کہتا ہے — یہ دنیا کا سب سے چھوٹا ہے ... اپنا بھانڈا کیوں اس پر پھوڑتی ہے ... یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی۔

انگلیاں ... اُدھر کیوں نہ اٹھیں گی جدھر وہ اپنی ہستی مکمل کر کے چلا

گیا تھا — کیا ان انگلیوں کو وہ راستہ معلوم نہیں . . . یہ دنیا ایک چوراہا ہے
. . . لیکن اس وقت تو وہ مجھے ایک دوراہے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا — ادھر بھی
ادھورا پن تھا۔ اُدھر بھی ادھورا پن — ادھر بھی آنسو، اُدھر بھی آنسو۔

لیکن یہ کس کا آنسو، میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے — یہ کہاں
بندھے گا؟

انگلیاں اٹھیں گی — جب سیپ کا منہ کھلے گا اور موتی پھسل کر باہر چوراہے
میں گر پڑے گا تو انگلیاں اٹھیں گی — سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی . . .
اور یہ انگلیاں سنپولیاں بن بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو
نیلا کر دیں گی۔

آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے . . . یہ
گر کیوں نہیں پڑتا . . . وہ کون سے ستون ہیں جو اس کو تھامے ہوئے ہیں . . .
کیا اس دن جو زلزلہ آیا تھا وہ ان ستونوں کی بنیادیں ہلا دینے کے لئے کافی نہیں
تھا . . . یہ کیوں اب تک میرے سر کے اوپر اسی طرح تنا ہوا ہے؟

میری روح پسینے میں غرق ہے . . . اس کا ہر مسام کھلا ہوا ہے۔
چاروں طرف آگ دہک رہی ہے . . . میرے اندر کٹھالی میں سونا پگھل رہا ہے
. . . دھونکنیاں چل رہی ہیں۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ سونا آتش فشاں پہاڑ کے
لاوے کی طرح ابل رہا ہے — میری رگوں میں نیلی آنکھیں دوڑ دوڑ کر ہانپ

رہی ہیں... گھنٹیاں بج رہی ہیں... کوئی آ رہا ہے... کوئی آ رہا ہے۔
بند کر دو ــــ بند کر دو کواڑ....
کٹھالی الٹ گئی ہے... پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہے... گھنٹیاں بج رہی
ہیں... وہ آ رہا ہے... میری آنکھیں مندی ہیں... نیلا آسمان گدلا ہو کر
نیچے آ رہا ہے....
پر کس کے رونے کی آواز ہے... اسے چپ کراؤ... اس کی چیخیں میرے
دل پر ہتھوڑے مار رہی ہیں ــــ چپ کراؤ ــــ اسے چپ کراؤ ــــ اسے
چپ کراؤ... میں گود بن رہی ہوں... میں کیوں گود بن رہی ہوں....
میری باہیں کھل رہی ہیں ــــ چولھوں پر دودھ ابل رہا ہے ــــ میرے
سینے کی گولائیاں پیالیاں بن رہی ہیں... لاؤ اس گوشت کے لوتھڑے کو
میرے دل کے دھڑکتے ہوئے خون کے نرم نرم گاروں میں لٹا دو....
مت چھینو ــــ مت چھینو اسے... مجھ سے جدا نہ کرو۔ خدا کے لئے
مجھ سے جدا نہ کرو۔
انگلیاں... انگلیاں... اٹھنے دو انگلیاں ــــ مجھے کوئی پروا
نہیں... یہ دنیا چور راہا ہے... پھوٹنے دو میری زندگی کے تمام
بھانڈے...
میری زندگی تباہ ہو جائے گی؟... ہو جانے دو... مجھے میرا گوشت

واپس دے دو . . . میری روح کا یہ ٹکڑا مجھ سے مت چھینو . . . تم نہیں جانتے یہ کتنا قیمتی ہے . . . . یہ گوہر ہے جو مجھے ان چند لمحات نے عطا کیا ہے . . ان چند لمحات نے جنہوں نے میرے وجود کے کئی ذرے چن چن کر کسی کی تکمیل کی تھی اور مجھے اپنے خیال میں ادھورا چھوڑ کے چلے گئے تھے . . . . میری تکمیل آج ہوئی ہے ۔

مان لو . . . مان لو . . . میرے پیٹ کے خلا سے پوچھو —— میری دودھ بھری ہوئی چھاتیوں سے پوچھو —— ان لوریوں سے پوچھو جو میرے انگ انگ اور روم روم میں تمام تھپکیاں سلا کر آگے بڑھ رہی ہیں —— ان جھولنوں سے پوچھو جو میرے بازوؤں میں ڈالے جا رہے ہیں ۔

میرے چہرے کی زردیوں سے پوچھو جو گوشت کے اس لوتھڑے کے گالوں کو اپنی تمام سرخیاں چُساتی رہی ہیں . . . اُن سانسوں سے پوچھو جو چھپے چوری اس کو اس کا حصہ پہنچاتے رہے ہیں ۔

انگلیاں —— ٹھنڈی دو انگلیاں . . . میں انہیں کاٹ ڈالوں گی . . . شور مچے گا . . . میں یہ انگلیاں اٹھا کر اپنے کانوں میں ٹھونس لوں گی —— میں گونگی ہو جاؤں گی ، بہری ہو جاؤں گی ، اندھی ہو جاؤں گی . . . میرا گوشت ، میرے اشارے سمجھ لیا کرے گا . . . میں اسے ٹٹول ٹٹول کر پہچان لیا کروں گی . . . . مت چھینو . . . مت چھینو اسے —— یہ میری کوکھ کی مانگ کا سیندور

ہے — یہ میری ممتا کے ملنے کی بندیا ہے . . . . میرے گناہ کا کڑوا پھل ہے؟

— لوگ اس پر تھوتھو کریں گے؟ . . . . میں چاٹ لوں گی یہ سب تھوکیں . . . .

آنول بچھ کر صاف کر دوں گی . . . .

دیکھو، میں ہاتھ جوڑتی ہوں — تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔

میرے بھرے بھرے شیر دودھ کے برتن اوندھے نہ کرو . . . میرے دل کے دھڑکتے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں آگ نہ لگاؤ — میری باہوں کے جھولوں کی رسیاں نہ توڑو — میرے کانوں کو ان گیتوں سے محروم نہ کرو جو اس کے رونے میں مجھے سنائی دیتے ہیں۔

مت چھینو — مت چھینو . . . مجھ سے جدا نہ کرو — خدا کے لیے مجھے اس سے جدا نہ کرو۔

لاہور۔ ۲۱ جنوری

دھوبی منڈی سے پولیس نے ایک نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی سنگدل نے بچی کی گردن کو مضبوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے۔ مگر وہ زندہ تھی۔ بچی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

معراج

ناگپاڑہ پولیس چوکی کے اس طرف جو چھوٹا سا باغ ہے، اس کے بالکل سامنے ایرانی کے ہوٹل کے باہر بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر ڈھونڈو کا ٹھیا تھا۔ دن ڈھلے، مقررہ وقت پر وہ یہاں آجاتا اور صبح چار بجے تک اپنے دھندے میں مصروف رہتا۔

معلوم نہیں اس کا اصل نام کیا تھا، مگر سب اسے ڈھونڈو کہتے تھے۔ اس لحاظ سے تو یہ بہت مناسب تھا کہ اس کا کام اپنے موکلوں کے لئے ان کی خواہش اور پسند کے مطابق ہر نسل اور ہر رنگ کی لڑکیاں ڈھونڈنا تھا۔

یہ دھندہ وہ قریب قریب دس برس سے کر رہا تھا۔ اس دوران میں ہزاروں لڑکیاں اس کے ہاتھوں سے گزر چکی تھیں۔ ہر مذہب کی، ہر نسل کی، ہر مزاج کی

اس کا اڈہ شروع سے یہیں رہا تھا۔ ناگپاڑہ پولس چوکی کے اس طرف۔ باغ کے بالکل سامنے۔ ایرانی ہوٹل کے باہر بجلی کے کھمبے کے ساتھ —— کھمبا اس کا نشان بن گیا تھا۔ بلکہ مجھے تو وہ ڈھونڈو ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں جب کبھی ادھر سے گذرتا اور میری نظر اس کھمبے پر پڑتی جس پر جگہ جگہ چونے اور کتھے کی انگلیاں پونچھی گئی تھیں تو مجھے ایسا لگتا کہ ڈھونڈو کھڑا اپنے اندر کا لے کا غذ مٹی اور سینکے کی سپاری والا پان چبا رہا ہے۔

یہ کھمبا کافی اونچا تھا۔ ڈھونڈو بھی دراز قد تھا —— کھمبے کے اوپر بجلی کے تاروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ کوئی تار دور تک دوڑتا چلا گیا تھا اور دوسرے کھمبے کے تاروں کے الجھاؤ میں مدغم ہو گیا تھا۔ کوئی تار کسی بلڈنگ میں اور کوئی کسی دکان میں چلا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کھمبے کی پہنچ دور دور تک ہے جہاں وہ دوسرے کھمبوں سے مل کر گویا سارے شہر پر چھایا ہوا ہے۔

اس کھمبے کے ساتھ ٹیلیفون کے محکمے نے ایک بکس لگا رکھا تھا جس کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً تاروں کی درستی وغیرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ڈھونڈو بھی اسی قسم کا ایک بکس ہے جو لوگوں کی جنسی جانچ پڑتال کرنے کے لیے کھمبے کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے آس پاس کے علاقے کے علاوہ دور دور کے علاقوں کے ان تمام شخصوں کا پتا تھا جن کو وقفوں کے بعد یا ہمیشہ ہی اپنی جنسی خواہشات کے تنے ہوئے یا ڈھیلے تار درست کرانے کی ضرورت

محسوس ہوتی تھی۔

اسے ان تمام چھوکریوں کا بھی پتا تھا جو اس دھندے میں تھیں۔ وہ ان کے جسم کے ہر خدوخال سے واقف تھا۔ ان کی ہر نبض سے آشنا تھا۔ کون کس مزاج کی ہے اور کس وقت اور کس گاہک کے لیے موزوں ہے۔ اس کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ لیکن ایک صرف اس کو سراج کے متعلق ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

ڈھونڈو کئی بار مجھ سے کہہ چکا تھا "سالی کا متک پھرا ہے — سمجھ میں نہیں آتا منٹو صاحب کیسی چھوکری ہے — گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولا — کبھی آگ، کبھی پانی۔ ہنس رہی ہے۔ قہقہے لگا رہی ہے — لیکن ایک دم رونا شروع کر دے گی — سالی کی کسی سے نہیں بنتی — بڑی جھگڑالو ہے۔ ہر پسنجر سے لڑتی ہے۔ سالی سے کئی بار کہہ چکا کہ دیکھ، اپنا متک ٹھیک کر، ورنہ جا جہاں سے آئی ہے — انگ پہ تیرے کوئی کپڑا نہیں — کھانے کو تیرے پاس ڈبڈھیا نہیں — مارا ماری اور دھاندلی سے تو میری جان کام نہیں چلے گا — پر وہ ایک تخم ہے جو کسی کی نہیں سنتی"

میں نے سراج کو ایک دو مرتبہ دیکھا ہے۔ بڑی دبلی پتلی لڑکی تھی جس کی — آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی بڑی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے بیضوی چہرے پر صرف اپنی بڑائی جتانے کی خاطر چھائی ہوئی ہیں میں

نے جب اس کو پہلی مرتبہ کلیئر روڈ پر دیکھا تھا تو مجھے بڑی الجھن ہوئی تھی۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس کی آنکھوں سے کہوں کہ بھئی تم تھوڑی دیر کے لیے ذرا ایک طرف ہٹ جاؤ تاکہ میں سراج کو دیکھ سکوں۔ لیکن میری اس خواہش کے باوجود جو یقیناً میری آنکھوں نے اس کی آنکھوں تک پہنچا دی ہوگی، وہ اسی طرح اس کے سفید بیضوی چہرے پر چھائی رہیں۔

مختصر سی تھی، مگر اس اختصار کے باوجود بڑی جامع معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک صراحی ہے جس میں اس کے حجم سے زیادہ پانی ملی ہوئی شراب بھرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نتیجے کے طور پر یہ سیال چیز دباؤ کے باعث ادھر اُدھر، تڑپ کر بہہ گئی ہے۔

میں نے پانی ملی ہوئی شراب اس لئے کہا ہے کہ اس میں تلخی تھی، وہی جو تیز و تند شراب کی ہوتی ہے، مگر ایسا لگتا تھا کسی دھوکے باز نے اس میں پانی ملا دیا ہے تاکہ مقدار زیادہ ہو جائے۔ مگر سراج میں نسائیت کی جو مقدار تھی، ویسی کی ویسی موجود تھی اور اس جھنجھلاہٹ سے جو اس کے گھنے بالوں سے اس کی تیکھی ناک سے، اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے اور اس کی انگلیوں سے جو نقشہ نویسوں کی نوکیلی اور تیز تیز پنسلیں معلوم ہوتی تھیں، میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ ہر چیز سے ناراض ہے۔ ڈھونڈو سے ـــ اس کھمبے سے جس کے ساتھ لگ کر وہ کھڑا رہتا تھا ـــ ان گاہکوں سے جو اس کے لئے لائے

جاتے تھے ——— اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی جو اس کے سفید بیضوی چہرے پر قبضہ جمائے رکھتی تھیں۔

اس کی پتلی پتلی، نوکیلی انگلیاں جو نقشہ نویسوں کی پنسلوں کی طرح تیز تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے بھی ناراض ہے۔ شاید اس لئے کہ جو نقشہ سراج بنانا چاہتی تھی وہ نہیں بنا سکتی تھیں۔

یہ تو ایک افسانہ نگار کے تاثرات ہیں جو چھوٹے سے تل میں سنگِ اسود کی تمام سختیاں بیان کر سکتا ہے ——— آپ ڈھونڈو کی زبانی سراج کے متعلق سنئے اس نے مجھ سے ایک دن کہا: "منٹو صاحب ——— آج سالی نے پھر ٹنٹا کر دیا ——— وہ تو جانے کس دن کا ثواب کام آگیا ——— اور آپ کی دعا سے یوں بھی ناگپاڑہ چوکی کے سب افسر مہربان ہیں، ورنہ کل ڈھونڈو اندر ہوتا ——— وہ دھمال مچاتی کہ بس تو باپ رے باپ کہتا رہ گیا"

میں نے اس سے پوچھا: "کیا بات ہوئی تھی؟"

"وہی جو ہوا کرتی ہے ——— میں نے لاکھ لعنت بھیجی اپنی ہشت پشت پر کہ حرامی جب تو اس چھوکری کو اچھی طرح جانتا ہے تو پھر کیوں انگلی لیتا ہے ——— کیوں اس کو نکال کر لاتا ہے۔ تیری ماں لگتی ہے یا بہن ——— میری تو کوئی عقل کام نہیں کرتی منٹو صاحب!"

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ڈھونڈو نے کوئی ملی چائے

بدن میں انڈیلی اور سڑپ سڑپ پینے لگا۔ "اصل بات یہ ہے کہ سالی سے مجھے ہمدردی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

ڈھونڈو نے سر کو ایک جھٹکا دیا "جانے کیوں ہے — یہ سالا معلوم ہو جائے تو یہ روز کا ٹنٹا ختم نہ ہو۔" پھر اس نے ایک دم پرچ میں پیالی اوندھی کر کے مجھ سے کہا "آپ کو معلوم ہے — ابھی تک کنواری ہے۔"

یقین مانیے کہ میں ایک لحظے کے لیے چکرا گیا "کنواری؟"

"آپ کی جان کی قسم"

میں نے جیسے اس کو اپنی بات پر نظرثانی کرنے کے لیے کہا "نہیں ڈھونڈو۔"

ڈھونڈو کو میرا یہ شک ناگوار معلوم ہوا "میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا منٹو صاحب — سولہ آنے کنواری ہے — آپ مجھ سے شرط لگا لیجئے۔"

میں صرف اسی قدر کہہ سکا "مگر ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟"

ڈھونڈو نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا "ایسا کیوں ہونے کو نہیں سکتا — سراج جیسی چھوکری تو اس دھندے میں بھی رہ کر ساری عمر کنواری رہ سکتی ہے — سالی کسی کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی — مجھے اس کی ساری ہسٹری معلوم نہیں — اتنا جانتا ہوں۔ پنجابن ہے — لیمنگٹن روڈ

پر میم صاحب کے پاس تھی۔ وہاں سے نکالی گئی کہ ہر منیجر سے لڑتی تھی۔ دو تین مہینے نکل گئے کہ مڈام کے پاس دس بیس اور چھوکریاں تھیں — پر منٹو صاحب کوئی کب تک کسے کھلاتا ہے — اس نے ایک دن تین کپڑوں میں نکال باہر کیا — یہاں سے فارس روڈ میں دوسری مڈام کے پاس پہنچی۔ وہاں بھی اس کا مستک ویسے کا ویسا تھا۔ ایک منیجر کے کاٹ کھایا — دو تین مہینے یہاں گذر گئے . . . . پر سالی کے مزاج میں تو جیسے آگ بھری ہوئی ہے۔ اب کون اسے ٹھنڈا کرتا پھرے — پھر خدا آپ کا بھلا کرے، کھیت واڑی کے ایک ہوٹل میں رہی — پر یہاں بھی وہی دھمال — منیجر نے تنگ آکر چلتا کیا — کیا بتاؤں منٹو صاحب۔ نہ سالی کو کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا۔ — کپڑوں میں جوئیں پڑی ہیں۔ سر دو دو مہینے سے نہیں دھویا — چرس کے ایک دو سگریٹ مل جائیں کہیں سے تو چھونک لیتی ہے — یا کسی ہوٹل سے دور کھڑی ہو کر فلمی ریکارڈ سنتی رہتی ہے۔"

میرے لئے یہ تفصیل کافی تھی۔ اس کے ردِ عمل سے میں آپ کو آگاہ نہیں کرنا چاہتا کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ نامناسب ہے۔

میں نے ڈھونڈو سے محض سلسلۂ گفتگو قائم رکھنے کے لئے پوچھا۔ "تم اسے واپس کیوں نہیں بھیج دیتے۔ جب کہ اسے اس دھندے سے کوئی دلچسپی نہیں — کرایہ تم مجھ سے لے لو!"

ڈھونڈو کو یہ بات بھی ناگوار معلوم ہوئی "منٹو صاحب کیا ایسے سلسلے کی کیا بات ہے — میں نہیں دے سکتا۔"

میں نے ٹوہ لینی چاہی "پھر تم اسے واپس کیوں نہیں بھیجتے؟"

ڈھونڈو کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو گیا۔ کان میں اڑسے ہوئے سگرٹ کا ٹکڑا نکال کر اس نے سلگایا اور دھوئیں کو ناک کے دونوں نتھنوں سے باہر پھینک کر اس نے صرف اتنا کہا "میں نہیں چاہتا کہ وہ جائے۔"

میں نے سمجھا اب مجھے ہر اس دھاگے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں آگیا ہے

"کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

ڈھونڈو پر اس کا شدید ردعمل ہوا "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں منٹو صاحب، —— پھر اس نے دونوں کان پکڑ کر کھینچے "قرآن کی قسم میرے دل میں ایسا پلید خیال کبھی نہیں آیا — مجھے بس ..." وہ رک گیا "مجھے بس، کچھ اچھی لگتی ہے!"

میں نے بڑا صحیح سوال کیا "کیوں؟"

ڈھونڈو نے بھی اس کا بڑا صحیح جواب دیا "اس لئے — اس لئے کہ وہ دوسروں جیسی نہیں — باقی جتنی ہیں، سب پیسے کی پیر ہیں — حرامی ہیں اوّل درجے کی — پر یہ جو ہے نا — کچھ عجیب و غریب ہے — نکال کے لاتا ہوں تو راضی ہو جاتی ہے — سودا ہو جاتا ہے — ٹیکسی یا وکٹوریہ میں بیٹھ

جاتی ہے ___ اب منٹو صاحب، پلیسجر سالا موج شوق کے لئے آتا ہے ___ مال
پانی خرچ کرتا ہے ___ ذرا دو باکے دیکھتا ہے ___ یا ویسے ہی ہاتھ لگا کے دیکھتا
ہے ___ بس دھمال مچ جاتی ہے۔ ہمارا ماری شروع کر دیتی ہے ___ آدمی
شریف ہو تو بھاگ جاتا ہے۔ پیسہ لا ہو ___ یا موالی ہو تو آفت . . . . ہر
مستے پر مجھے پہنچنا پڑتا ہے۔ پیسے واپس کرنے پڑتے ہیں اور ہاتھ پیر
الگ جوڑنے پڑتے ہیں ___ قسم قرآن کی صرف سراج کی خاطر . . . اور
منٹو صاحب آپ کی جان کی قسم اسی سالی کی وجہ سے میرا دھندا آدھا رہ گیا
ہے ___!

میرے ذہن نے سراج کا جو عقبی منظر تیار کیا تھا، میں اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا ہے کہ جو کچھ ڈھونڈو نے مجھے بتایا وہ اس کے ساتھ ٹھیک طور پر جمتا نہیں تھا۔

میں نے ایک دن سوچا کہ ڈھونڈو کو بتائے بغیر سراج سے ملوں۔ وہ بائی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی ایک نہایت واہیات جگہ میں رہتی تھی۔ جہاں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ آس پاس کا تمام غلیظ تھا۔ کارپوریشن نے یہاں غریبوں کے لئے جست کے بے شمار جھونپڑے بنا دیئے تھے۔ میں یہاں ان بلند بام عمارتوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتا جو اس غلاظت گاہ سے تھوڑی دور ایستادہ تھیں۔ کیونکہ ان کا اس افسانے سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا نام ہی

سڑک کے۔

نشیب و فراز کا ہے۔ یا رفعتوں اور پستیوں کا۔

ڈھونڈو سے مجھے اس کے جھونپڑے کا اتا پتا معلوم تھا۔ میں وہاں گیا۔ —— اپنے خوش وضع کپڑوں کو اس ماحول سے چھپاتے ہوئے —— لیکن یہاں میری ذات متعلق نہیں۔

بہر حال میں وہاں گیا —— جھونپڑے کے باہر ایک بکری بندھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو ممیائی۔ اندر سے ایک بڑھیا نکلی —— جیسے پرانی داستانوں کے کرم خوردہ انبار سے کوئی کٹی لاٹھی ٹیکتی ہوتی —— میں لوٹنے ہی والا تھا کہ ٹاٹ کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے مجھے دو بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں —— بالکل اسی طرح پھٹی ہوئی جس طرح وہ ٹاٹ کا پردہ تھا۔ پھر میں نے سراج کا سفید بیضوی چہرہ دیکھا اور مجھے ان غاصب آنکھوں پر بڑا غصہ آیا۔

اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اندر کیا کام کر رہی تھی۔ فوراً سب چھوڑ چھاڑ باہر آئی۔ اس نے بڑھیا کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور مجھ سے کہا "آپ یہاں کیسے آئے؟"

میں نے مختصراً کہا "تم سے ملنا تھا"۔

سراج نے بھی اختصار ہی کے ساتھ کہا "آؤ اندر!"

میں نے کہا "نہیں میرے ساتھ چلئے"۔

اس پر کرم خوردہ داستانوں کی کرم خوردہ کٹنی بڑے دکاندارانہ انداز میں

بولی: "دس روپے ہوں گے"

میں نے بٹوہ نکال کر دس روپے اس بڑھیا کو دے دیئے اور سراج سے کہا: "آؤ سراج" ——!

سراج کی بڑی بڑی آنکھوں نے ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں کو راستہ دیا کہ اس کے چہرے کی سڑک پر چند قدم چل سکیں —— میں ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ خوبصورت تھی —— سکڑی ہوئی خوبصورتی، حنوط لگی خوبصورتی۔ صدیوں کی محفوظ، مامون اور مدفون کی ہوئی خوبصورتی —— میں نے ایک لمحے کے لیے یوں محسوس کیا کہ میں مصر میں ہوں اور پرانے دفینوں کی کھدائی پر مامور کیا گیا ہوں۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا —— سراج میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں ایک ہوٹل میں تھے۔ وہ میرے سامنے، اپنے غلیظ کپڑوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے بیضوی چہرے پر قبضہ جمائے ہوئے تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے صرف سراج کے چہرے ہی کو نہیں، اس کے سارے وجود کو ڈھانپ لیا ہے کہ میں اس کے کسی روش کو بھی نہ دیکھ سکوں۔

بڑھیا نے جو قیمت بتائی تھی، میں نے ادا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے چالیس روپے اور سراج کو دیے تھے —— میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بھی اسی طرح لڑے جھگڑے، جس طرح وہ دوسروں کے ساتھ لڑتی جھگڑتی ہے۔ چنانچہ اسی

غرض کہ میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہ کی جس سے محبت اور خلوص کی بو آئے ۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بھی میں نا واقف تھا۔ وہ اتنی بڑی تھیں کہ میرے علاوہ میرے ارد گرد کی ساری دنیا بھی دیکھ سکتی تھیں۔

وہ خاموش تھی ۔۔۔ واہیات طریقے پر اسے چھیڑنے کے لئے ضروری تھا کہ میرے جسم اور دماغ میں غلط قسم کی حرارت ہو۔ چنانچہ میں نے وسکی کے چار پگ پئے اور اس کو عام ہیجڑوں کی طرح چھیڑا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے ایک زبردست فضول حرکت کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بارود جو اس کے اندر بھری پڑی ہے اس کو کہیں سے اڑانے کے لئے یہ چنگاری کافی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ وہ کسی قدر پرسکون ہو گئی۔ اٹھ کر اس نے مجھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: "تھری کاسل کا ایک سگرٹ منگوا دیجئے!"

"شراب پیو!"

"نہیں ۔۔۔ تھری کاسل کا سگرٹ پیوں گی!"

میں نے اسے تھری کاسل کا سگرٹ منگوا دیا ۔۔۔ اسے ٹھیٹ درویشوں کے انداز میں پی کر اس نے میری طرف دیکھا ۔۔۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اب اپنا تسلط چھوڑ چکی تھیں ۔۔۔ مگر اسی طرح جس طرح کوئی غاصب چھوڑتا ہے ۔۔۔ اس کا چہرہ مجھے ایک اجڑی ہوئی، ایک برباد شدہ سلطنت نظر آیا ۔۔۔ شکست و تاراج ملک، اس کا ہر خط، ہر خال ۔۔۔ ویرانی کی ایک لکیر تھی۔۔۔

مگر یہ ویرانی کیا تھی؟ —— کیوں تھی؟ —— بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آبادیاں ہی ویرانوں کا باعث ہوتی ہیں —— کیا وہ ایسی ہی تعمیر تھی؟ کوئی آبادی تھی جو شروع ہونے کے بعد کسی حملہ آور کے باعث ویران ہو گئی تھی اور آہستہ آہستہ اس کی دیواریں جو ابھی کھڑی رہ گئی تھیں اور بعض ابھی تعمیر طلب تھیں، کھنڈر بن گئی تھیں۔

میں چکر میں تھا، لیکن آپ کو میں اس چکر میں نہیں ڈالنا چاہتا —— میں نے کیا سوچا، کیا نتیجہ برآمد کیا۔ اس سے آپ کو کیا مطلب۔

سراج کنواری تھی یا نہیں، میں اس کے متعلق جاننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کے وجود میں، البتہ اس کی محبوس دوشیزگی کا بھنور تھا، مجھے ایک ایسی جھلک سی نظر آتی تھی کہ میرا قلم بھی بیان نہیں کر سکتا۔

میں نے اس سے باتیں کرنا چاہیں مگر اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھ سے لڑے جھگڑے، مگر یہاں بھی اس نے مجھے مایوس کیا۔

میں اسے گھر چھوڑ آیا۔

ڈھونڈو کو جب میرے اس خفیہ مشغلے کا پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اس کے دوستانہ اور تاجرانہ جذبات دونوں بہت بری طرح مجروح ہوئے تھے۔ اس نے مجھے صفائی کا موقعہ نہ دیا۔ صرف اتنا کہا "سیٹھ صاحب، آپ سے یہ امید نہ تھی"۔ اور یہ کہہ کر وہ مجھ سے منہ پھیر کر ایک طرف چلا گیا۔

عجیب بات ہے کہ دوسرے روز شام کو وقت مقررہ پر مجھے وہ

اڈے پر نظر نہ آیا۔ میں سمجھا شاید بیمار ہے۔ مگر اس سے اگلے روز بھی وہ موجود نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ وہاں سے میرا صبح شام آنا جانا ہوتا تھا۔ میں جب اس کھمبے کو دیکھتا۔ مجھے ڈھونڈو یاد آتا۔ میں بائی کلہ اسٹیشن کے پاس ہی جو دابیاتی جگہ تھی وہاں بھی گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ سراج کہاں ہے۔ مگر وہاں اب صرف وہ کرم خوردہ کشتی رہتی تھی۔ میں نے اس سے سراج کے متعلق پوچھا تو وہ بولی مسکراہٹ میں لاکھوں برس کی پرانی عشق کر وٹیں بدل کر بولی "وہ گئی ہے — اور میں — منگواؤں!"

میں نے سوچا، اس کا کیا مطلب ہے۔ ڈھونڈو اور سراج دونو غائب ہیں اور وہ بھی میری اس خفیہ ملاقات کے بعد — لیکن میں اس ملاقات کے متعلق اتنا متردد نہیں تھا — یہاں پھر میں اپنے خیالات آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے یہ حیرت ضرور تھی کہ وہ دونوں غائب کہاں ہو گئے۔ ان میں محبت کی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈھونڈو ایسی چیزوں سے بالاتر تھا۔ اس کی بیوی تھی بچے تھے اور وہ ان سے بے حد محبت کرتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ کیا تھا کہ دونو بیک وقت غائب تھے۔

میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ اچانک ڈھونڈو کے دماغ میں یہ خیال آ گیا ہو کہ سراج کو واپس گھر جانا چاہیئے۔ اس کے متعلق وہ پہلے فیصلہ نہیں کر سکا

تھا، پر اب اچانک کر لیا ہو۔

غالباً ایک مہینہ گذر گیا۔

ایک شام اچانک مجھے ڈھونڈو نظر آیا۔ ابھی کھمبے کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بڑی دیر کرنٹ فیل رہنے کے بعد ایک دم واپس آگیا ہے اس کھمبے میں جان پڑ گئی۔ ٹیلی فون کے ڈبے میں بھی ـــ چاروں طرف، اوپر، تاروں کے پھیلے ہوئے جال، ایسا لگتا تھا آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

میں اس کے پاس سے گذرا ـــ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔

ہم دونوں ایرانی کے ہوٹل میں تھے۔ میں نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ اس نے اپنے لئے کوفی ملی چائے اور میرے لئے سادہ چائے منگوائی اور پہلو بدل کر اس نے ایسی نشست قائم کی کہ جیسے وہ مجھے کوئی بہت بڑی بات سنانے والا ہے، مگر اس نے صرف اتنا کہا "اور سناؤ منٹو صاحب"۔

"کیا سنائیں، ڈھونڈو ـــ بس گذر رہی ہے"۔

ڈھونڈو مسکرایا "ٹھیک کہا آپ نے ـــ بس گذر رہی ہے ـــ اور گذرتی جائے گی ـــ لیکن یہ سالا گذرتے رہنا یا گذرنا بھی عجیب چیز ہے ـــ سچ پوچھئے تو اس دنیا میں ہر چیز عجیب ہے"۔

میں نے صرف اتنا کہا "تم ٹھیک کہتے ہو ڈھونڈو"۔

چائے آئی اور ہم دونوں نے پینا شروع کی۔ ڈھونڈو نے پرچ میں پی

کرنی پڑی چاہئے انڈیلی اور مجھ سے کہا "منٹو صاحب ـــ اس نے مجھے بتادی
تھی ساری بات ـــ کہتی تھی، وہ سیٹھ جو تمہارا دوست ہے اس کا مستک
پھرے لا ہے۔"

میں ہنسا "کیوں؟"

"بولی ـــ مجھے ہوٹل لے گیا ـــ اتنے روپے دیئے ـــ پر سیٹھوں والی
کوئی بات نہ کی۔"

میں اپنے اناڑی پن پر بہت خفیف ہوا۔ وہ قصہ ہی کچھ ایسا تھا۔ ڈھونڈو
اب ڈھونڈو پیٹ بھر کے ہنسا "میں جانتا ہوں ـــ مجھے معاف
کر دینا کہ میں اس روز تم سے ناراض ہو گیا تھا۔" اس کے انداز گفتگو میں ان جانے
میں بے تکلفی پیدا ہو گئی "پر اب وہ قصہ ختم ہو گیا ہے!"

"کون سا قصہ؟"

"اس سالی سرج کا ـــ اور کس کا؟"

میں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

ڈھونڈو کھلنے لگا "جس روز آپ کے ساتھ گئی تھی ـــ واپس آکر مجھ
سے کہنے لگی ـــ میرے پاس چالیس روپے ہیں ـــ چلو مجھے لاہور لے
چلو ـــ میں بولا، سالی، یہ ایک دم تیرے سر پہ کیا بھوت سوار ہوا ـــ بولی
نہیں، چل ڈھونڈو، تجھے میری قسم ـــ اور منٹو صاحب آپ جانتے ہیں

— میں سالی کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا کہ مجھے اچھی لگتی ہے — میں نے
کہا چل — سو ٹکٹ کٹا کے ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے — لاہور
پہنچ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرے — مجھ سے بولی۔ ڈھونڈو۔ ایک برقعہ لا دو
میں لے آیا — اسے پہن کر وہ لگی سڑک سڑک اور گلی گلی گھومنے......
کئی دن گزر گئے — میں بولا۔ یہ بھی اچھی رہی ڈھونڈو۔ سراج جو سالی کا مستک
تو پھرے لاتا۔ سالا تیرا بھی بھیجا پھر گیا جو تو آگئی اور اس کے ساتھ آگیا
— منٹو صاحب۔ آخر ایک دن اس نے تانگہ رکوایا اور ایک آدمی کی طرف
اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگی — ڈھونڈو — اس آدمی کو میرے پاس
لے آ — میں چلتی ہوں واپس سرائے میں — میری عقل عجائب ہو گئی
— میں تانگے سے اترا تو وہ غائب — اب میں اس آدمی کے پیچھے
پیچھے — آپ کی دعا سے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے — میں آدمی آدمی
کو پہچانتا ہوں۔ دو باتیں کیں اور پتہ لگ گیا کہ موج شوق کرنے والا ہے — میں بولا
بمبئی کا خاص مال ہے — بولا: ابھی چلو — میں بولا۔ نہیں پہلے مال پانی
دکھاؤ۔ اس نے اپنے سارے نوٹ دکھا دئیے — میں دل میں بولا — چلو
ڈھونڈو — یہاں بھی اپنا دھندا چلتا رہے — پر میری سمجھ میں یہ بات نہیں
آتی تھی کہ سراج سالی نے سارے لاہور میں اس کو کیوں چنا..... میں نے
کہا چلتا ہے..... تانگہ لیا اور سیدھا سرائے میں — سراج کو خبر کی

— وہ بولی "ابھی ٹھیر — میں ٹھیر گیا — تھوڑی دیر کے بعد اس آدمی کو جو اچھی شکل کا تھا اندر لے گیا — سراج کو دیکھتے ہی وہ سالا یوں بدکا جیسے گھوڑا — پھر سراج نے اس کو پکڑ لیا"

ڈھونڈو نے یہاں پہنچ کر پیالی سے اپنی ٹھنڈی کوفی ہی جائے ایک ہی جرعے میں ختم کی اور بیڑی سلگانے لگا۔

میں نے اس سے کہا "سراج نے اس کو پکڑ لیا"

ڈھونڈو نے بلند آواز میں کہا "ہاں جی — پکڑ لیا اس سالے کو — کہنے لگی۔ اب تو کہاں جاتا ہے — میرا گھر چھڑا کر تو مجھے اپنے ساتھ کس لئے لایا تھا . . . میں تجھ سے محبت کرتی تھی . . . تو نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے — پر جب میں اپنا گھر بار، اپنا ماں باپ چھوڑ کر تیرے ساتھ بھاگ نکلی اور امرتسر سے ہم دونوں یہاں — اسی سرائے میں آکر ٹھیرے تو رات ہی رات تو بھاگ گیا — مجھے اکیلا چھوڑ کر — کس لئے لایا تھا تو مجھے یہاں — کس لئے بھگایا تھا تو نے مجھے — میں ہر چیز کے لئے تیار تھی — پر تو میری ساری تیاریاں چھوڑ کر بھاگ گیا — آ — اب میں نے تمہیں بلایا ہے — میری محبت ویسی کی ویسی قائم ہے . . . آ . . . اور منٹو صاحب، وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی — اس سالے کے آنسو ٹپکنے لگے . . . رو رو کر معافیاں مانگنے لگا — کہ مجھ سے

غلطی ہوئی — میں ڈر گیا تھا — میں اب کبھی تم سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔ قسمیں کھاتا رہا . . . . جانے کیا بکتا رہا — سراج نے مجھے اشارہ کیا — میں باہر چلا گیا — صبح ہوئی تو میں باہر کھاٹ پر سو رہا تھا — سراج نے مجھے جگایا اور کہا — چلو ڈھونڈو — میں بولا۔ کہاں؟ — بولی، واپس بمبئی — میں بولا — وہ سالا کہاں ہے — سراج نے کہا۔ سو رہا ہے — میں اس پہ اپنا برقعہ ڈال آئی ہوں۔"

ڈھونڈو نے اپنے لئے دوسری کوئی ملے چائے کا آرڈر دیا تو سراج اندر داخل ہوئی — اس کا سفید بیضوی چہرہ نکھرا ہوا تھا اور اس پر اس کی بڑی بڑی آنکھیں دو گڑے ہوئے سگنل معلوم ہوتی تھیں۔

سو کینڈل پاور کا بلب

وہ چوک میں قیصر پارک کے باہر جہاں چند تانگے کھڑے رہتے ہیں، بجلی کے ایک کھمبے کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!

یہی پارک جو صرف دو برس پہلے اتنی پُر رونق جگہ تھی اب اجڑی اجڑی دکھائی تھی۔ جہاں پہلے عورت اور مرد شوخ و شنگ فیشن کے لباسوں میں چلتے پھرتے تھے۔ وہاں اب بے حد میلے کچیلے کپڑوں میں لوگ ادھر ادھر بے مقصد پھر رہے تھے۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی مگر اس میں وہ رنگ نہیں تھا جو ایک میلے ٹھیلے کا ہوا کرتا تھا۔ آس پاس کی سیمنٹ سے بنی ہوئی بلڈنگیں اپنا روپ کھو چکی تھیں۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

جیسے بیوہ عورتیں۔

وہ حیران تھا کہ وہ خانہ کہاں گیا۔ وہ سینہ در کہاں اڑ گیا۔ وہ ٹُبہ کہاں غائب ہو گئے جو اس نے کبھی یہاں دیکھے اور سنے تھے ——— زیادہ عرصہ کی بات نہیں، ابھی وہ کل ہی تو (دو برس بھی کوئی عرصہ ہوتا ہے) یہاں آیا تھا کلکتے سے جب اسے یہاں کی ایک فرم نے اچھی تنخواہ پر بلایا تھا تو اس نے قیصر پارک میں کتنی کوشش کی تھی کہ اسے کرائے پر ایک کمرہ ہی مل جائے مگر وہ ناکام رہا تھا۔ ہزار فرمائشوں کے باوجود۔

مگر اب اس نے دیکھا کہ جس کنجڑے، جولاہے اور موچی کی طبیعت چاہتی تھی۔ فلیٹوں اور کمروں پر اپنا قبضہ جما رہا تھا۔

جہاں کسی شاندار فلم کمپنی کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ وہاں چولھے سلگ رہے ہیں۔ جہاں کبھی شہر کی بڑی بڑی رنگین ہستیاں جمع ہوتی تھیں۔ وہاں دھوبی میلے کپڑے دھو رہے ہیں۔

دو برس میں اتنا بڑا انقلاب!

وہ حیران تھا۔ لیکن اس کو اس انقلاب کا پس منظر معلوم تھا۔ اخباروں کے ذریعہ سے اور ان دوستوں سے جو شہر میں موجود تھے اسے سب پتہ لگ چکا تھا کہ یہاں کیسا طوفان آیا تھا۔ مگر وہ سوچتا تھا کہ یہ کوئی عجیب و غریب طوفان تھا جو عمارتوں کا رنگ روپ بھی چوس کر لے گیا۔ انسانوں نے انسان قتل کئے

عورتوں کی بے عزتی کی۔ لیکن عمارتوں کی خشک لکڑیوں اور ان کی اینٹوں سے بھی یہی سلوک کیا۔

اس نے سنا تھا کہ اس طوفان میں عورتوں کو ننگا کیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیاں کاٹی گئی تھیں۔ یہاں اس کے آس پاس جو کچھ تھا۔ سب ننگا اور چھاتی بریدہ تھا۔ وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ جس کی مدد سے وہ اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ اس دوست نے اس سے کہا تھا کہ تم قیصر پارک کے پاس جہاں تانگے کھڑے رہا کرتے ہیں میرا انتظار کرنا۔

دو برس ہوئے جب وہ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا تھا تو یہ تانگوں کا اڈا بہت مشہور جگہ تھی۔ سب سے عمدہ، سب سے بانکے تانگے صرف یہیں کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے عیاشی کا ہر سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اچھے سے اچھا ریسٹورنٹ اور ہوٹل قریب تھا، بہترین چائے، بہترین کھانا اور دوسرے لوازمات بھی۔

شہر کے جتنے بڑے دلال تھے وہ یہیں سے دستیاب ہوتے تھے۔ اس لئے کہ قیصر پارک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے باعث روپیہ اور شراب پانی کی طرح بہتے تھے۔

اس کو یاد آیا کہ دو برس پہلے اس نے اپنے دوست کے ساتھ بڑے

عیش کیئے تھے۔ ابھی سے اچھی لڑکی ہر رات کو اُن کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اسکاچ جنگ کے باعث نایاب تھی مگر ایک منٹ میں درجنوں بوتلیں مہیا ہو جاتی تھیں۔ ٹانگے اب بھی کھڑے تھے مگر اُن پر وہ کلنیاں، وہ پھندنے، وہ پیتل کے پالش کیئے ہوئے ساز و سامان کی چمک دمک نہیں تھی۔ یہ بھی شاید دوسری چیزوں کے ساتھ اڑ گئی تھی۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ فروری کے دن تھے، شام کے سائے چھانے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو لعنت ملامت کی اور دائیں ہاتھ کے ویران ہوٹل میں موری کے پانی سے بنائی ہوئی چائے پینے کے لیئے جانے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کو پیچھے سے پکارا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اس کا دوست آ گیا، مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک اجنبی تھا۔ عام شکل و صورت کا، لٹھے کی نئی شلوار میں جس میں اب اور زیادہ شکنوں کی گنجائش نہیں تھی۔ نیلی پاپلین کی قمیص میں جو لانڈری میں جانے کے لیئے بیتاب تھی۔

اس نے پوچھا

"کیوں بھئی۔ تم نے مجھے بلایا ہے"

اس نے ہولے سے جواب دیا

"جی ہاں۔"

اس نے خیال کیا کہ شاید یہ بھیک مانگنا چاہتا ہے "کیا مانگتے ہو؟"

اس نے اسی لہجے میں جواب دیا "جی کچھ نہیں" پھر قریب آکر کہا "کچھ چاہیے آپ کو؟"

"کیا؟"

"کوئی لڑکی وڑکی" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے سینے میں ایک تیر سا لگا کہ دیکھو اس زمانے میں بھی یہ لوگوں کے جنسی جذبات ٹٹولتا پھرتا ہے ——— اور پھر انسانیت کے متعلق اوپر تلے اس کے دماغ میں بڑے حوصلہ شکن خیالات آئے۔ انہی خیالات کے زیر اثر اس نے پوچھا "کہاں ہے؟"

اس کا لہجہ دلال کے لئے امید افزا نہیں تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"جی نہیں آپ کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔"

اس نے اس کو روکا "یہ تم نے کس طرح جانا۔ انسان کو ہر وقت اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تم مہیا کر سکتے ہو ——— وہ سولی پر بھی ——— جلتی چتا میں بھی..." وہ فلسفی بننے ہی والا تھا کہ رک گیا "دیکھو ——— اگر کہیں پاس ہی ہے تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے یہاں ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے۔"

دلّال قریب آگیا "پاس ہی ـــ بالکل پاس"۔
"کہاں؟"
"یہ سامنے والی بلڈنگ میں"۔
اس نے سامنے والی بلڈنگ کو دیکھا۔
"اس میں ـــ اس بڑی بلڈنگ میں؟"
"جی ہاں"۔
وہ لرز گیا: "اچھا ـــ تو ـــ؟"
سنبھل کر اس نے پوچھا "میں بھی چلوں؟"
"چلئے ـــ لیکن میں آگے آگے چلتا ہوں"۔ اور دلّال نے سامنے والی بلڈنگ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔
وہ سینکڑوں روح شگاف باتیں سوچتا اس کے پیچھے ہولیا۔
چند گزوں کا فاصلہ تھا۔ فوراً طے ہو گیا۔ دلّال اور وہ دونوں اس بڑی بلڈنگ میں تھے جس کی پیشانی پر ایک بورڈ لٹک رہا تھا ـــ اس کی حالت سب سے خستہ تھی، جگہ جگہ اکھڑی ہوئی اینٹوں، کٹے ہوئے پانی کے نلوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔
اب شام گہری ہو گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر آگے بڑھے تو اندھیرا شروع ہو گیا۔ چوٹا چکلا صحن طے کر کے وہ ایک طرف مڑا۔ جہاں عمارت بنتے بنتے

رک گئی تھی ننگی اینٹیں تھیں۔ چونا اور سیمنٹ ملے ہوئے سخت ڈھیر پڑے تھے اور جا بجا بجری بکھری ہوئی تھی۔

دلال نامکمل سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ مڑ کر اس نے کہا۔

"آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ابھی آیا۔"

وہ رک گیا۔ دلال غائب ہو گیا۔ اس نے منہ اوپر کر کے سیڑھیوں کے اختتام کی طرف دیکھا تو اسے تیز روشنی نظر آئی۔

دو منٹ گذر گئے تو دبے پاؤں وہ بھی اوپر چڑھنے لگا۔ آخری زینے پر اسے دلال کی بہت زور کی کڑک سنائی دی۔

"اٹھتی ہے کہ نہیں؟"

کوئی عورت بولی "کہہ جو دیا مجھے سونے دو"۔ اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

دلال پھر کڑکا "میں کہتا ہوں اٹھ۔۔۔ میرا کہا نہیں مانے گی تو یاد رکھ۔۔۔"

عورت کی آواز آئی "تو مجھے مار ڈال۔۔۔ لیکن میں نہیں اٹھوں گی۔ خدا کے لئے میرے حال پر رحم کر۔"

دلال نے پچکارا "اٹھ میری جان۔ ضد نہ کر۔ گزارہ کیسے چلے گا؟"

عورت بولی "گزارہ جائے جہنم میں۔ میں بھوکی مر جاؤں گی۔ خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کر۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

دلال کی آواز کڑی ہو گئی "تو نہیں اٹھے گی۔ حرامزادی، سور کی بچی۔۔۔"

عورت چلّانے لگی "میں نہیں اٹھوں گی — نہیں اٹھوں گی — نہیں اٹھوں گی"

دلاّل کی آواز بھینچ گئی۔

"آہستہ بول — کوئی سن لے گا — لے چل اٹھ — تیس چالیس روپے مل جائیں گے"

عورت کی آواز میں التجا تھی "دیکھ میں ہاتھ جوڑتی ہوں — میں کتنے دنوں سے جاگ رہی ہوں — رحم کر — خدا کے لئے مجھ پر رحم کر —"

"بس ایک دو گھنٹے کے لئے — پھر سو جانا — نہیں تو دیکھ مجھے سختی کرنی پڑے گی"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں بڑی تیز روشنی آ رہی تھی۔

اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس کے فرش پر ایک عورت لیٹی ہے — کمرے میں دو تین برتن ہیں، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دلاّل اس عورت کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس عورت سے کہا "لے اب اٹھ — قسم خدا کی ایک دو گھنٹے میں آ جائے گی — پھر سو جانا"

وہ عورت ایک دم یوں اٹھی جیسے آگ دکھائی ہوئی پھلجھڑی اٹھتی ہے اور

چلائی۔ "اچھا اٹھتی ہوں"۔

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اصل میں وہ ڈر گیا تھا۔ دبے پاؤں وہ تیزی سے سیڑھی اتر گیا۔ اس نے سوچا کہ بھاگ جائے ـــــ اس شہر ہی سے بھاگ جائے۔ اس دنیا سے بھاگ جائے ـــــ مگر کہاں؟

پھر اس نے سوچا کہ یہ عورت کون ہے؟ کیوں اس پر اتنا ظلم ہو رہا ہے؟ ـــــ اور یہ دلال کون ہے؟ ـــــ اس کا کیا لگتا ہے اور یہ اس کمرے میں اتنا بڑا بلب جلا کر جو سو کینڈل پاور سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ کیوں رہتے ہیں۔ کب سے رہتے ہیں؟

اس کی آنکھوں میں اس تیز بلب کی روشنی ابھی تک گھسی ہوئی تھی۔ اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی تیز روشنی میں کون سو سکتا ہے؟ ـــــ اتنا بڑا بلب؟ ـــــ کیا وہ چھوٹا نہیں لگا سکتے۔ یہی پندرہ بیس کینڈل پاور کا؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ دو سائے اس کے پاس کھڑے ہیں۔ ایک نے جو دلال کا تھا۔ اس سے کہا:

"دیکھ لیجئے"۔

اس نے کہا۔ "دیکھ لیا ہے"۔

"ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے۔"

"چالیس روپے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"دے دیجئے۔"

وہ اب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیب میں اس نے ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر دلّال کے حوالے کر دیئے۔

"دیکھو کتنے ہیں؟"

نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔

دلّال نے کہا۔ "پچاس ہیں۔"

اس نے کہا۔ "پچاس ہی رکھو۔"

"صاحب سلام۔"

اس کے جی میں آئی کہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے دے مارے۔

دلّال بولا۔ "تو لے جائیے اسے۔ لیکن دیکھئے تنگ نہ کیجئے گا اور پھر ایک دو گھنٹے کے بعد چھوڑ جائیے گا۔"

"بہتر۔"

اس نے بڑی بلڈنگ کے باہر نکلنا شروع کیا جس کی پیشانی پر وہ کئی بار ایک بہت بڑا بورڈ پڑھ چکا تھا۔

باہر تانگہ کھڑا تھا۔ وہ آگے بیٹھ گیا اور عورت پیچھے۔

دلالی نے ایک بار پھر سلام کیا اور ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

تانگہ چل پڑا ـــ وہ اسے پاس ہی ایک ویران سے ہوٹل میں لے گیا ـــ دماغ کو حتی المقدور اس تکدر سے جو اسے پہنچ چکا تھا نکال کر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا جو سر سے پیر تک اجاڑ تھی ـــ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ بھی سارے کا سارا خمیدہ تھا جیسے وہ ایک ایسی عمارت ہے جو پل بھر میں گر جائے گی۔

وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"ذرا گردن تو اونچی کیجیے"۔

وہ زور سے چونکی "کیا؟"

"کچھ نہیں ـــ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی بات تو کیجیے"۔

اس کی آنکھیں سرخ بوٹی ہو رہی تھیں جیسے ان میں مرچیں ڈالی گئی ہوں ـــ وہ خاموش رہی۔

"آپ کا نام؟"

"کچھ بھی نہیں"۔ اس کے لہجے میں تیزاب کی سی تیزی تھی۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

"جہاں کی بھی تم سمجھ لو۔"

"آپ اتنا روکھا کیوں بولتی ہیں۔"

عورت اب قریب قریب جاگ پڑی اور اس کی طرف لال بوٹی آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگی "تم اپنا کام کرو۔ مجھے جانا ہے۔"

اس نے پوچھا "کہاں؟"

عورت نے بڑی روکھی بے اعتنائی سے جواب دیا "جہاں سے مجھے تم لائے ہو۔"

"آپ چلی جائیے۔"

"تم اپنا کام کرو نا ــــ مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟"

اس نے اپنے لہجے میں دل کا سارا درد بھر کے اس سے کہا "میں تمہیں تنگ نہیں کرتا ــــ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

وہ جھنجلا گئی "مجھے نہیں چاہیئے کوئی ہمدرد۔" پھر قریب قریب چیخ پڑی "تم اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو۔"

اس نے قریب آکر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس عورت نے زور سے ایک طرف جھٹک دیا۔

"میں کہتی ہوں۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ میں کئی دنوں سے جاگ رہی ہوں ــــ جب سے آئی ہوں۔ جاگ رہی ہوں۔"

وہ سرتاپا ہمدردی بن گیا۔

"سو جاؤ یہیں"۔

عورت کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ تیز لہجے میں بولی: "میں یہاں سونے نہیں آئی — یہ میرا گھر نہیں"۔

"تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم آئی ہو؟"

عورت اور زیادہ خشمناک ہو گئی۔

"اُف — بکواس بند کرو — میرا کوئی گھر نہیں — تم اپنا کام کرو ورنہ مجھے چھوڑ آؤ اور اپنے روپے لے لو اس . . . اس. . . ." وہ گالی دیتی رہ گئی۔

اس نے سوچا کہ اس عورت سے ایسی حالت میں کچھ پوچھنا اور ہمدردی جتانا فضول ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں"۔

اور وہ اسے اس بڑی بلڈنگ میں چھوڑ آیا۔

دوسرے دن اس نے قیصر پارک کے ایک ویران ہوٹل میں اس عورت کی ساری داستان اپنے دوست کو سنائی۔ دوست پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا:

"کیا جوان تھی؟"

اس نے کہا۔" مجھے معلوم نہیں ـــ میں اسے اچھی طرح بالکل نہ دیکھ سکا ـــ میرے دماغ میں تو ہر وقت یہ خیال آتا تھا کہ میں نے وہیں سے پتھر اٹھا کر دلال کا سر کیوں نہ کچل دیا۔"

دوست نے کہا۔" واقعی بڑے ثواب کا کام ہوتا۔"

وہ زیادہ دیر تک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ اس کے دل و دماغ پر پچھلے روز کے واقعہ کا بہت بوجھ تھا۔ چنانچہ چائے ختم ہوئی تو دونوں رخصت ہو گئے۔

اس کا دوست چپکے سے تانگوں کے اڈے پر آیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نگاہیں اس دلال کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نظر نہ آیا۔ چھ بج چکے تھے۔ بڑی بلڈنگ سامنے تھی چند گزوں کے فاصلے پر۔ وہ اس طرف چل دیا اور اس میں داخل ہو گیا۔

لوگ اندر آ جا رہے تھے۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے اس مقام پر پہنچ گیا۔ کافی اندھیرا تھا مگر جب وہ ان سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اسے روشنی دکھائی دی اوپر دیکھا اور دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر وہ آخری زینے پر خاموش کھڑا رہا۔ کمرے سے تیز روشنی آ رہی تھی۔ مگر کوئی آواز نہ کوئی آہٹ اسے سنائی نہ دی۔ آخری زینہ طے کر کے وہ آگے بڑھا۔ دروازے

کے پٹ کھلے تھے۔ اس نے ذرا ادھر ہٹ کر اندر جھانکا۔ سب سے پہلے اسے بلب نظر آیا جس کی روشنی اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ ایک دم وہ پرے ہٹ گیا تاکہ تھوڑی دیر اندھیرے کی طرف منہ کر کے اپنی آنکھوں سے چکاچوند نکال سکے۔

اس کے بعد وہ پھر دروازے کی طرف بڑھا مگر اس انداز سے کہ اس کی آنکھیں بلب کی تیز روشنی کی زد میں نہ آئیں۔ اس نے اندر جھانکا ــــ فرش کا جو حصہ اسے نظر آیا۔ اسی پر ایک عورت چٹائی پر لیٹی تھی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ سو رہی تھی ــــ منہ پر دوپٹہ تھا۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا ــــ اس کی چیخ نکل گئی مگر اس نے فوراً ہی دبا لی ــــ اس عورت سے کچھ دور ہٹ کے فرش پر ایک آدمی پڑا تھا جس کا سر پاش پاش تھا ــــ پاس ہی خون آلود اینٹ پڑی تھی۔ یہ سب اس نے ایک دم دیکھا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا ــــ پاؤں پھسلا اور نیچے ــــ مگر اس نے چوٹوں کی کوئی پروا نہ کی اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل اپنے گھر پہنچا اور ساری رات ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔

خُدا کی قسم

اُدھر سے مسلمان اور اِدھر سے ہندو ابھی تک آجا رہے تھے۔ کیمپوں کے کیمپ بھرے پڑے تھے جن میں ضرب المثل کے تل دھرنے کے لیئے واقعی کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ غلّہ ناکافی ہے، حفظانِ صحت کا کوئی انتظام نہیں۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ اس کا ہوش کس کو تھا۔ ایک افراط و تفریط کا عالم تھا۔

سن اڑتالیس کا آغاز تھا۔ غالباً مارچ کا مہینہ۔ اِدھر اور اُدھر دونوں طرف رضاکاروں کے ذریعے سے "مغویہ" عورتوں اور بچوں کی برآمدگی کا مستحسن کام شروع ہو چکا تھا۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اس کارِ خیر میں حصہ لے رہی تھیں۔ میں جب ان کو سرگرم عمل دیکھتا تو مجھے بڑی

تعجب خیز مسرت حاصل ہوتی۔ یعنی خود انسان، انسان کی برائیوں کے آثار مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا جو عصمتیں لٹ چکی تھیں ان کو مزید لوٹ کھسوٹ سے بچانا چاہتا تھا۔ کس لئے؟

اس لئے کہ اس کا دامن مزید دھبوں اور داغوں سے آلودہ نہ ہو۔؟ اس لئے کہ وہ جلدی جلدی اپنی خون سے لتھڑی ہوئی انگلیاں چاٹ لے اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر روٹی کھائے؟ — اس لئے کہ وہ انسانیت کا سوئی دھاگا لے کر، جب تک دوسرے آنکھیں بند کئے ہیں۔ عصمتوں کے چاک رفو کر دے؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا — لیکن ان رضاکاروں کی جدوجہد پھر بھی قابلِ قدر معلوم ہوتی تھیں۔

ان کو سیکڑوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہزاروں بکھیڑے تھے جو انہیں اٹھانے پڑتے تھے۔ کیونکہ جنہوں نے عورتیں اور لڑکیاں اڑائی تھیں، سیماب پا تھے۔ آج اِدھر، کل اُدھر۔ ابھی اس محلے میں، ابھی اس محلے میں۔ اور پھر آس پاس کے آدمی بھی ان کی مدد نہیں کرتے تھے۔

عجیب عجیب داستانیں سننے میں آتی تھیں — ایک لیاژان افسر نے مجھے بتایا کہ سہارن پور میں دو لڑکیوں نے پاکستان میں اپنے والدین کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے نے بتایا کہ جب جالندھر میں زبردستی ہم نے

ایک لڑکی کو نکالا تو قابض کے سارے خاندان نے اسے یوں الوداع کہی جیسے وہ ان کی بہو ہے اور کسی دور دراز سفر پر جا رہی ہے ــــ کئی لڑکیوں نے والدین کے خوف سے رستے میں خودکشی کر لی۔ بعض صدموں کی تاب نہ لا کر پاگل ہو چکی تھیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں جن کو شراب کی لت پڑ چکی تھی۔ ان کو پیاس لگتی تو پانی کی بجائے شراب مانگتیں اور ننگی ننگی گالیاں بکتیں۔

میں ان برآمد کی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے متعلق سوچتا تو میرے ذہن میں صرف پھولے ہوئے پیٹ ابھرتے ـــــ ان پیٹوں کا کیا ہو گا۔ ان میں جو کچھ بھرا ہے، اس کا مالک کون ہے ـــــ پاکستان یا ہندوستان؟

اور وہ نو مہینے کی باربرداری ـــ اس کی اجرت پاکستان ادا کرے گا یا ہندوستان؟ ـــــ کیا یہ سب ظالم فطرت یا قدرت کے بہی کھاتے میں درج ہو گا؟ ـــ مگر کیا اس میں کوئی صفحہ خالی رہ گیا ہے؟

برآمدہ عورتیں آ رہی تھیں۔ برآمدہ عورتیں جا رہی تھیں۔

میں سوچتا تھا کہ یہ عورتیں مغویہ کیوں کہلائی جاتی تھیں ـــ انہیں اغوا کب کیا گیا ہے؟ ـــ اغوا تو ایک بڑا رومانٹک فعل ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی کھائی ہے جس کو پھاندنے سے پہلے دونوں روحوں کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ لیکن یہ اغوا کیسا ہے کہ ایک نہتی کو پکڑ کر کوٹھڑی میں قید کر لیا۔

لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ منطق، استدلال اور فلسفہ بیکار چیزیں تھیں۔
ان دنوں جس طرح لوگ گرمیوں میں بھی دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے سوتے تھے۔ اسی طرح میں نے بھی اپنے دل و دماغ کی سب کھڑکیاں دروازے بند کر دیئے تھے۔ حالانکہ انہیں کھلا رکھنے کی زیادہ ضرورت اسی وقت تھی لیکن میں کیا کرتا، مجھے کچھ سوجھتا نہیں تھا۔

برآمدہ عورتیں آ رہی تھیں برآمدہ عورتیں جا رہی تھیں۔

یہ درآمد اور برآمد جاری تھی ـــ تمام تاجر اپنی خصوصیات کے ساتھ اور صحافی، افسانہ نگار اور شاعر اپنے قلم اٹھائے شکار میں مصروف تھے ـــ لیکن افسانوں اور نظموں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ قلموں کے قدم اکھڑ اکھڑ جاتے تھے۔ اتنے صید تھے کہ سب بوکھلا گئے تھے۔

ایک لیاڑاں افسر مجھ سے ملا کہنے لگا "تم کیوں گم سم رہتے ہو؟"
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے مجھے ایک داستان سنائی:

"مغویہ عورتوں کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ پھر تیسرے گاؤں۔ پھر چوتھے۔ گلی گلی، محلے محلے . . . کوچے کوچے ـــ بڑی مشکلوں سے گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔

میں نے دل میں کہا: "کیسے گوہر... گوہرِ ناسفتہ ـــ یا سفتہ؟"

"تمہیں معلوم نہیں، ہمیں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے... لیکن میں تمہیں ایک بات بتانے والا تھا... ہم بورڈر کے اس پار سیکڑوں پھیرے کر چکے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ میں نے ہر پھیرے میں ایک بڑھیا کو دیکھا۔ ایک مسلمان بڑھیا کو... ادھیڑ عمر کی تھی... پہلی مرتبہ میں نے اسے جالندھر کی بستیوں میں دیکھا۔ پریشان حال، ماؤف دماغ۔ ویران ویران آنکھیں۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال، پھٹے ہوئے کپڑے۔ اسے تن کا ہوش تھا نہ من کا۔ لیکن اس کی نگاہوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

مجھے ـــ بہن نے بتایا کہ یہ عورت صدمے کے باعث پاگل ہو گئی ہے۔ پٹیالہ کی رہنے والی ہے۔ اس کی اکلوتی لڑکی تھی جو اسے نہیں ملتی۔ ہم نے بہت جتن کئے ہیں اسے ڈھونڈھنے کے لئے مگر ناکام رہے ہیں۔ غالباً بلووں میں ماری گئی ہے مگر یہ بڑھیا نہیں مانتی۔

دوسری مرتبہ میں نے اس پگلی کو سہارن پور کے لاریوں کے اڈے پر دیکھا۔ اس کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ ابتر اور خستہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر موٹی موٹی پیپڑیاں جمی تھیں۔ بال سادھوؤں کے سے بنے تھے ـــ میں نے اس سے بات چیت کی اور چاہا کہ وہ اپنی موہوم تلاش چھوڑ دے۔ چنانچہ میں

۔نہ اس غرض سے بہت سنگدل بن کر اس سے کہا "مائی، تیری لڑکی قتل کر دی گئی تھی"۔
پنگلی نے میری طرف دیکھا "قتل ؟۔۔ نہیں"۔ اس کے لہجے میں فولادی یقین پیدا ہو گیا۔ "اُسے کوئی قتل نہیں کر سکتا ۔۔ میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا"۔

اور وہ چلی گئی۔ اپنی موہوم "تلاش میں۔

میں نے سوچا "ایک تلاش اور پھر موہوم !۔۔ لیکن پنگلی کو کیوں اتنا یقین تھا کہ اس کی بیٹی پر کوئی کرپان نہیں اٹھ سکتی۔ کوئی تیز دھار یا کند چھرا اس کی گردن کی طرف نہیں بڑھ سکتا ۔۔ کیا وہ امر تھی ۔۔ یا کیا اس کی ممتا امر تھی ۔۔ ممتا تو خیر امر ہوتی ہے، پھر کیا وہ اپنی ممتا ڈھونڈ رہی تھی ۔۔ کیا اس نے اسے کہیں کھو دیا۔ ۔ ۔ ۔؟

تیسرے پھیرے پر میں نے اسے پھر دیکھا۔ اب وہ بالکل چیتھڑوں میں تھی۔ قریب قریب ننگی۔ میں نے اس کو کپڑے دیئے مگر اس نے قبول نہ کیے۔
میں نے اس سے کہا "مائی، میں سچ کہتا ہوں، تیری لڑکی پٹیالے ہی میں قتل کر دی گئی تھی"۔

اس نے پھر اسی فولادی یقین کے ساتھ کہا "تو جھوٹ کہتا ہے"۔
میں نے اس سے اپنی بات منوانے کی خاطر کہا "نہیں۔ میں سچ کہتا

ہوں۔ کافی روپیہ لیا ہے تم نے ۔۔۔ چلو میرے ساتھ، میں تم کو پاکستان لے چلوں گا۔"

اس نے میری بات نہ سنی اور بڑبڑانے لگی۔ بڑبڑاتے بڑبڑاتے وہ ایک دم چونکی۔ اب اس کے لہجے میں یقین پہلے سے بھی زیادہ ٹھوس تھا۔ "نہیں ۔۔۔ میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا!"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

بڑھیا نے ہولے ہولے کہا۔ "وہ خوبصورت ہے ۔۔۔ اتنی خوبصورت ہے کہ اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا ۔۔۔ اسے طمانچہ تک نہیں مار سکتا۔"

میں سوچنے لگا۔ "کیا واقعی وہ اتنی خوبصورت تھی؟ ۔۔۔ ہر ماں کی آنکھوں میں اس کی اولاد چندے آفتاب چندے مہتاب ہوتی ہے ۔۔۔ لیکن ہو سکتا ہے وہ لڑکی درحقیقت خوبصورت ہو ۔۔۔ مگر اس طوفان میں کونسی خوبصورتی ہے جو انسان کے کھردرے ہاتھوں سے بچی ہے ۔۔۔ ہو سکتا ہے پگلی اس خیال خام کو دھوکا دے رہی ہو ۔۔۔ فرار کے لاکھوں راستے ہیں ۔۔۔ دکھ ایک ایسا چوک ہے جو اپنے اردگرد لاکھوں بلکہ کروڑوں سڑکوں کا جال بن دیتا ہے ۔۔۔"

بورڈر کے اس پار کئی پھیرے ہوئے۔ ہر بار میں نے اس پگلی کو دیکھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ بینائی کمزور ہو چکی تھی۔ ٹٹول ٹٹول کر چلتی تھی، مگر اس کی تلاش جاری تھی۔ بڑی شدومد سے۔ اس کا یقین اسی طرح مستحکم تھا کہ

اس کی بیٹی زندہ ہے، اس لئے کہ اسے کوئی مار نہیں سکتا۔

ـــ بہن نے مجھ سے کہا کہ اس عورت سے مغز ماری فضول ہے۔ اس کا دماغ چل چکا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اسے پاکستان لے جاؤ اور پاگل خانے میں داخل کرا دو۔

میں نے مناسب نہ سمجھا۔ میں اس کی موہوم تلاش جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی۔ میں اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے ایک وسیع و عریض پاگل خانے سے جس میں وہ میلوں کی مسافت طے کر کے اپنے پاؤں کے آبلوں کی پیاس بجھا سکتی تھی۔ اٹھا کر ایک مختصر سی چار دیواری میں قید کرانا نہیں چاہتا تھا۔

آخری بار میں نے اسے امرتسر میں دیکھا۔ اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے پاکستان لے جاؤں گا اور پاگل خانے میں داخل کرا دوں گا۔

وہ فرید کے چوک میں کھڑی اپنی نیم اندھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ چوک میں کافی چہل پہل تھی۔ میں ـــ بہن کے ساتھ ایک دکان پر بیٹھا ایک مغویہ لڑکی کے متعلق بات چیت کر رہا تھا جس کے متعلق ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ بازار صبونیاں میں ایک ہندو لالے کے گھر موجود ہے۔ یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں اٹھا کہ اس پگلی سے جھوٹ سچ کہہ کر اسے پاکستان جانے کے لئے آمادہ کروں۔

کہ ایک جوڑا ادھر سے گذرا ۔۔۔ عورت نے گھونگھٹ کاڑھا ہوا تھا ۔ چھوٹا سا گھونگھٹ ۔ اس کے ساتھ ایک سکھ نوجوان تھا ۔ بڑا چھیل چھبیلا ۔ بڑا تندرست اور تیکھے تیکھے نقشوں والا ۔

جب یہ دونوں اس پگلی کے پاس سے گذرے تو نوجوان ایک دم ٹھٹک گیا ۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر عورت کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ کچھ اس اچانک طور پر کہ لڑکی نے اپنا چھوٹا سا گھونگھٹ اٹھایا ۔ لٹھے کی دھلی ہوئی سفید چادر کے چوکھٹے میں مجھے ایک ایسا گلابی چہرہ نظر آیا جس کا حسن بیان کرنے سے میری زبان عاجز ہے ۔

میں ان کے بالکل پاس تھا ۔ سکھ نوجوان نے اس حسن و جمال کی دیوی سے اس پگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا "تمہاری ماں!"

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے پگلی کی طرف دیکھا اور گھونگھٹ چھوڑ لیا اور سکھ نوجوان کا بازو پکڑ کر بھنچے ہوئے لہجے میں کہا "چلو!"

اور وہ دونوں سڑک سے ذرا ادھر ہٹ کر تیزی سے آگے نکل گئے ۔۔۔ پگلی چلائی "بھاگ بھری ۔۔۔ بھاگ بھری!"

وہ سخت مضطرب تھی ۔۔۔ میں نے پاس جا کر اس سے پوچھا "کیا بات ہے مائی؟"

وہ کانپ رہی تھی "میں نے اس کو دیکھا ہے ۔۔۔ میں نے اس کو دیکھا ہے

میں نے پوچھا " کسے ؟"

اس کے ماتھے کے نیچے دو گڑھوں میں اس کی آنکھوں کے بے نور ڈھیلے متحرک تھے " اپنی بیٹی کو —— بھاگ بھری کو!"

میں نے پھر اس سے کہا " وہ مرکھپ چکی ہے مائی "

اس نے چیخ کر کہا " تم جھوٹ کہتے ہو!"

میں نے اس مرتبہ اس کو پورا یقین دلانے کی خاطر کہا " میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ وہ مر چکی ہے!"

یہ سنتے ہی وہ پگلی چوک میں ڈھیر ہو گئی۔

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا
تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی
ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔
آسمان بالکل صاف تھا، بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری
تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن
نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے
جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے
ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔
ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی ــــ رات کو

کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مار پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تروتازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ـــ محلے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ـــ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ـــ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ـــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ بنے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا: "نرنجن، یہ ٹھیکے وٹھیکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ ولی تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیا کرتا ہے ـــ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا "یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ـــ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں بمبئی ہے ـــ بمبئی۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ـــ بارہ برس سے!"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے اگر فساد برپا ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس کچھ منتر ہے ـــ یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ـــ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا

کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لئے اچھا تھا ــــ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا جھنگھڑ تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے جھنگھڑ سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ــــ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے ــــ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے جھنگھڑ سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں سختی، کھردرا پن نہیں تھا۔ وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح

مربی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ——— لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ ——— پھر بمبئی جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بُری نہیں تھی ——— خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے، وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے

خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوتی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید جبہ پہنے تھی جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں نیم چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ باہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔ مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی جھنڈوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔۔۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ

اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی رانیں ننگی ـــ بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور یہ
. . . جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل
ـــ ساری موذیل سے الجھا جیسے صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ "یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔" اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوریڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خودسر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ باہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھورتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں گوڈے گوڈے

دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی: "تم سکھ ہو — یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔"

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کون سی نازک باتیں — تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو — ہاں وہ میرے

یار ہیں ـــــ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔"

ترلوچن بڑے دکیلانہ انداز میں پوچھتا۔ "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی۔ "تم سچ مچ سکھ ہو ـــ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ـــ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو ـــ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔"

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی ـــ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے، وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک

روز جب کہ موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موذیل ——
کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔
"میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی —— "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو —— یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔"

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔ "تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو —— تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے —— تم خوبصورت ہو۔"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔
"میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں —— تم تکلیف نہ کرو۔"

ترلوچن چلایا "موذیل!"

موذیل دینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں "خدا کی قسم ــــ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ــــ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ــــ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی"

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ــــ اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبالیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پہ لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی " تمہارے بال بہت ملائم ہیں ـــ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ـــ ترلوچ ـــ تم یہ مجھے دے دو ۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فسٹ کلاس بڑا بناؤں گی"۔

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں ۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا " میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ـــ تم کیوں اڑاتی ہو ـــ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ـــ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا ۔ مگر صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ـــ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں "۔

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا " مجھے معلوم ہے "۔

" پھر " ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں " تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ـــ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں "۔

" مجھے معلوم ہے " بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی " میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی "۔

ترلوچن اچھل پڑا " سچ ؟ "

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید

مضبوط دانت ایک لمحے کے لیے چمکے: "ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا: "تو . . . تو کب؟"

موزیل الگ ہٹ گئی: "جب ــــ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!"

ترلوچن اس وقت 'جو ہو سو ہو' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا: "میں کل ہی کٹوا دوں گا!"

موزیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی: "تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ــــ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا: "تم دیکھ لوگی!"

"دیکھ لوں گی۔" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا ــــ وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی ــــ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرس پہ تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لئے آجائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا — موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا — ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو"۔

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے — ایسے ہی چلتا ہے"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آگیا جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا "شادی کل ہو گی!"

"ضرور" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انہیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا ـــــ ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گذری؟ ـــــ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ـــ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوتے تھے اور

بھوری چڑیوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موزیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موزیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر گدکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ۔۔۔ وہ بے حیا تھی، بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موزیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سیکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موزیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹاپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موزیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹاپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انہیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موزیل کس قماش کی لڑکی ہے، کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔

وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو — مجھے تم سے نفرت ہے!"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گذارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے — اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو — تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا — یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں — مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو — تم سکھ ہو — مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے۔ — شرم آنی چاہیئے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

نرلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا، مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا ــــ کرپال کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی، وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ــــ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری ـــ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ ـــ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ـــ آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا۔ جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ـــ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن، پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ـــ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"۔

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ـــ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ـــ ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی۔ "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔ "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو سکرٹ صاف کر سکے ـــ مگر

وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔" بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ___ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا "بیمار رہی ہو؟"

"نہیں" موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔" تم گویا کہ ___ اب پھر ___ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔" ہاں!"

"مبارک ہو" موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔" کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔" ہاں!"

"مبارک ہو ___ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں۔"

"یہ بہت بری بات ہے۔" موزیل کھڑی ہوئی اپنی انگلیوں میں اڑس کو اٹھی۔ "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے پھیڑا۔ "کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں۔"

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ موزیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ "تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اسی سے شادی کرے گا — موزیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے، بدصورت ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موزیل سے صرف

اتنا کہا۔" موزیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ـــــ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

موزیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔" وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ ـــــ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

"اس کو ابھی تک معلوم نہیں ـــــ داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی ـــــ محض انتقامی طور پر ـــــ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں ـــــ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔" ترلوچن نے اپنے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موزیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔" یہ بہت اچھا ہے۔۔۔ مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے ـــــ دیکھو کس زور سے کاٹتا ہے۔"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موزیل نے اس جگہ جہاں

پھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی "کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا "ترلوچ — تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی "تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو — جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل! — موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں — کسی بھی معاملے کی نزاکت — تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو — یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری "افسوس بی ڈیمنڈ — سلی ایڈیٹ — تم یہ سوچو کہ تمہاری اس . . . کیا نام ہے اس کا . . . اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے . . . تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے . . . تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے — تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو — اور بہت ڈرپوک۔ مجھے نڈر مرد چاہیے . . . لیکن چھوڑو

ان باتوں کو . . . . چلو آؤ، تمہاری اس کور کو لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا ـــ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا: "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے ـــ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں ـــ چلو آؤ میرے ساتھ۔"

"مگر سُنو تو ـــ کرفیو ہے۔"

"موذیل کے لئے نہیں ـــ چلو آؤ۔"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اُترنے والی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا "یہ تمہاری داڑھی ـــ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے ـــ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔"

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں؟"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا — وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو — گدھے کہیں کے .... اس کی جان کا سوال ہے — کیا نام ہے تمہاری اس کور کا، جس سے تم محبت کرتے ہو۔"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے — اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔"

موذیل چڑ گئی۔ "اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ — میں پوچھتی ہوں، کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں — اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے — اور شاید وہ اپنا انڈر ویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔"

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو — مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی — تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے۔"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں — اگر میں تمہارے

ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا — میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موزیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے — تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے — تمہاری وہ — کیا نام ہے اس بھڑوی کا — جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا — تم سکھ ہو — خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو!"

موزیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ "ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی — جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ "تم کپڑے نہیں پہنو گی!"

موزیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "نہیں — چلے گا اسی طرح۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی

اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پہ جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کیے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا "تم بہت ذلیل ہو۔"

موذیل مسکرائی "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی — اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے — ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات

کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی اس لیے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی ر، جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی "اے ۔۔۔ کدھر جا رہا ہے"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا "اوہ، تم ۔۔۔ ہم کو پہچانا نہیں تم نے ۔۔۔ موذیل . . ." پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا "ادھر اس باجو ۔ ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے ۔۔۔ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے . . ."

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا "لو پیو ۔۔"

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا "ہیر از لائٹ!"

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں

آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی — جس میں سے گزر کر انہیں — محلّے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرّت محسوس کر رہی ہے — خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا

"ترلوچ ڈیئر — اس طرح ڈرنا اچھا نہیں — تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا — سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے!"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے۔ جو اس محلّے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی — کچھ فاصلے پر

بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا: "کوئی بات نہیں — چلو آؤ۔"

دونوں چلنے لگے — ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آرہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا — کہ موذیل آگئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا: "اے کیا کرتا ہے — اپنے بھائی کو مارتا ہے — ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی: "کریم — اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا: "عیش کر سالی — عیش کر۔" پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا: "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا: "کوئی ذلیل حرکت نہیں —

سب چلتا ہے۔ . . آؤ۔"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ___ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کر کے دونو اس محلے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی موذیل نے پوچھا "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "تیسری گلی میں ___ نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ___ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا "ترلوچن ڈیئر ___ یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!"

موذیل جھنجھلا گئی "تمہاری مرضی ___ لیکن تم دیکھتے نہیں سامنے کیا ہو رہا ہے؟"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ___ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی

پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو، ایسا کرو — میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں — تم میرے پیچھے آنا — بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو — سمجھے — مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے — سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا "کون سا محلہ؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "دوسرا"

"چلو"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے محلے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی

"مہنگا سنگھ جی ۔۔۔ مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی: "کون؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ۔۔۔ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے ۔۔۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ۔۔۔ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا: "ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے۔"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا: "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ۔۔۔ اور اپنی ماتا جی سے بھی ۔۔۔ لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی "اسے پکڑ لیا انہوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ـــــ تم یہ کپڑے اتارو"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت دہشت زدہ ہوگئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا آزار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی "جاؤ، اسے لے جاؤ ـــ لیکن ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا "جاؤ ـــ جلدی نکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا "آؤ" مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جلتے کیوں نہیں ہو؟" موزیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔
ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"
"جہنم میں جائیں وہ — تم اسے لے جاؤ۔"
"اور تم؟"
"میں آجاؤں گی۔"

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑادھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انہوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔ کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موزیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا: "سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے — میں دروازہ کھولتی ہوں ...."

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ "دروازہ!"

موزیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔ "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں — تم میرے پیچھے بھاگنا — میں اوپر چڑھ جاؤں گی — تم بھی اوپر چلے آنا — یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے ...."

ترلوچن نے پھر پوچھا۔ "پھر؟"

موذیل نے کہا۔ "یہ تمہاری ـــ کیا نام ہے اس کا ـــ موقعہ پاکر نکل جائے ـــ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھادی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری ـــ سب بوکھلا گئے اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی ـــ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی ـــ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا ـــ اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی۔ ـــ پتھریلے فرش پر ـــ

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ارد گرد جمع ہو گئے ـــ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی "موذیل — موذیل"۔
موذیل نے اپنی بڑی بڑی بیہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا "جاؤ، دیکھو — میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں — میرا مطلب ہے وہ..."
ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا "تم سچ مچ سکھ ہو... جاؤ دیکھ کر آؤ"۔
ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا "یہ میاں بھائی ہے... لیکن بہت دادا قسم کا... میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں"۔
ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے... موذیل نے اطمینان کا سانس لیا — لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا "اوہ ڈیم اِٹ..." یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی "آل رائٹ ڈارلنگ — بائی بائی"۔
ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹاتی "لے جاؤ اس کو — اپنے اس مذہب کو" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بےحس ہو کر گر پڑا۔

صاحبِ کرامات

چوہدری موجو برگد کی گھنی چھاؤں کے نیچے کھری چارپائی پر بڑے اطمینان سے بیٹھا اپنا حقہ پی رہا تھا۔ دھوئیں کے ہلکے ہلکے لچھے اس کے منہ سے نکلتے تھے اور دوپہر کی ٹھہری ہوئی ہوا میں ہولے ہولے گم ہو جاتے تھے۔

وہ تڑکے سے اپنے بیلوں سے کھیت میں ہل چلاتا رہا تھا اور اب تھک گیا تھا۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ چیل بھی اپنا انڈا چھوڑ دے۔ مگر اب وہ اطمینان سے بیٹھا اپنے حقے کا مزا لے رہا تھا جو چسکیوں میں اس کی تھکن دور کر دیتا تھا۔ اس کا پسینہ خشک ہو گیا تھا۔ اس لئے ٹھہری ہوا اسے کوئی ٹھنڈک نہیں پہنچا رہی تھی مگر حقے کا ٹھنڈا ٹھنڈا لذیذ دھواں اس کے دل و دماغ میں ناقابلِ بیان سرور کی لہریں پیدا کر رہا تھا۔

اب وقت ہو چکا تھا کہ گھر سے اس کی اکلوتی لڑکی جیناں روٹی لسی لے کر آجائے۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتی تھی۔ حالانکہ گھر میں اس کا ہاتھ بٹانے والا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں تھی جس کو دو سال ہوئے مرتجو نے ایک طویل جھگڑے کے بعد انتہائی غصے میں طلاق دے دی تھی۔

اس کی جوان اکلوتی بیٹی جیناں بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ وہ اپنے باپ کا بہت خیال رکھتی تھی۔ گھر کا کام کاج جو اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بڑی مستعدی سے کرتی تھی کہ جو خالی وقت ملے اس میں چرخہ چلاتے اور پونیاں کاتتے۔ یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ جو گنتی کی تھیں ادھر ادھر کی خوش گپیوں میں گذار دے۔

چوہدری مرتجو کی زمین واجبی تھی مگر اس کے گذارے کے لئے کافی تھی۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا۔ ایک دور افتادہ جگہ پر جہاں سے ریل کا گذر نہیں تھا۔ ایک کچی سڑک تھی جو اسے دور ایک بڑے گاؤں کے ساتھ ملاتی تھی۔ چوہدری مرتجو ہر مہینے دو مرتبہ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اس گاؤں میں جاتا تھا جس میں دو تین دکانیں تھیں اور ضرورت کی چیزیں لے آتا تھا۔

پہلے وہ بہت خوش تھا۔ اس کو کوئی غم نہیں تھا۔ دو تین برس اس کو اس خیال نے البتہ ضرور ستایا تھا کہ اس کے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوتی، مگر پھر وہ یہ سوچ کر شاکر ہو گیا تھا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے ـــ مگر اب جس دن سے اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر میکے رخصت کر دیا تھا۔ اس کی

زندگی سوکھا ہوا اینچہ سی بن کے رہ گئی تھی۔ ساری طراوت جیسے اس کی بیوی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

چوہدری موجو مذہبی آدمی تھا۔ حالانکہ اسے اپنے مذہب کے متعلق صرف دو تین چیزوں ہی کا پتہ تھا کہ خدا ایک ہے جس کی پرستش لازمی ہے۔ محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ جن کے احکام ماننا فرض ہے اور قرآن پاک خدا کا کلام ہے جو محمدؐ پر نازل ہوا اور بس۔

نماز روزے سے وہ بے نیاز تھا۔ گاؤں بہت چھوٹا تھا جس میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ دس پندرہ گھر تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے دور دور۔ لوگ اللہ اللہ کرتے تھے۔ ان کے دل میں اس ذات پاک کا خوف تھا مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ قریب قریب ہر گھر میں قرآن موجود تھا۔ مگر پڑھنا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سب نے اسے احتراماً جزدان میں لپیٹ کر کسی اونچے طاق میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کی ضرورت صرف اسی وقت پیش آتی تھی۔ جب کسی سے کوئی سچی بات کہلوانی ہوتی تھی یا کسی کام کے لئے حلف اٹھوانا ہوتا تھا۔

گاؤں میں مولوی کی شکل اسی وقت دکھائی دیتی تھی جب کسی لڑکے یا لڑکی کی شادی ہوتی تھی۔ مرگ پر جنازہ وغیرہ وہ خود ہی پڑھ لیتے تھے۔ اپنی زبان میں۔

چوہدری موجو ایسے موقعوں پر زیادہ کام آتا تھا اس کی زبان میں اثر تھا۔

جس انداز سے وہ مرحوم کی خوبیاں بیان کرتا تھا اور اس کی مغفرت کے لئے دعا کرتا تھا۔ وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔

پچھلے برس جب اس کے دوست دینو کا جوان لڑکا مر گیا تو اس کو قبر میں اتار کر اس نے بڑے مؤثر انداز میں یہ کہا تھا، ہائے، کیا شیں جوان لڑکا تھا۔ تھوک پھینکتا تھا تو بیس گز دور جا کے گرتی تھی۔ اس کی پیشاب کی دھار کا تو آس پاس کے کسی گاؤں کھیڑے میں بھی مقابلہ کرنے والا موجود نہیں تھا اور بھینی پکڑنے میں تو جواب نہیں تھا اس کا ـــــ ہے گھسنی کا نعرہ مارتا اور دو انگلیوں سے یوں بھینی کھولتا جیسے کرتے کا بٹن کھولتے ہیں ـــــ دینو یار، تجھ پر آج قیامت کا دن ہے۔ . . . تو کبھی یہ صدمہ نہیں برداشت کرے گا ـــــ یار دلے سے مر جانا چاہئے تھا ـــــ ایسا شیں جوان لڑکا۔ ـــــ ایسا خوبصورت گبرو جوان ـــــ نیتی سنیاری جیسی سندر اور ہٹیلی ناری اس کو قابو کرنے کے لئے تعویذ دھاگے کراتی رہی ـــــ مگر بچ مرجا ـــــ دینو تیرا لڑکا لنگوٹ کا پکّا رہا ـــــ خدا کرے اس کو جنت میں سب سے خوبصورت حور ملے اور وہاں بھی لنگوٹ کا پکّا رہے۔ اللہ میاں خوش ہو کر اس پہ اپنی اور رحمتیں نازل کرے گا ـــــ آمین"۔

یہ چھوٹی سی تقریر سن کر دس بیس آدمی جن میں دینو بھی شامل تھا دھاڑیں مار مار کر رو پڑے تھے۔ خود چوہدری مرجو کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

موجو نے جب اپنی بیوی پھاتاں کو طلاق دینا چاہی تھی، تو اس نے مولوی بلانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ تین مرتبہ طلاق، طلاق، طلاق کہہ دو تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ قصہ اسی طرح ختم کیا تھا۔ مگر دوسرے ہی دن اس کو بہت افسوس ہوا تھا۔ بڑی ندامت ہوئی تھی کہ اس نے یہ کیا غلطی کی۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مگر طلاق تک نوبت نہیں آتی۔ اس کو درگزر کرنا چاہئے تھا۔

پھاتاں اس کو پسند تھی۔ گو وہ اب جوان نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اس کو اس کا جسم پسند تھا۔ اس کی باتیں پسند تھیں ــــ اور پھر وہ اس کی جیناں کی ماں تھی ــــ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا جو واپس نہیں آ سکتا تھا۔ چوہدری موجو جب بھی اس کے متعلق سوچتا تو اس کے سینے میں چولھے کا دھواں اس کے حلق میں تلخ گھونٹ بن بن کے جانے لگتا۔

جیناں خوبصورت تھی۔ اپنی ماں کی طرح۔ ان دو برسوں میں اس نے ایکدم بڑھنا شروع کر دیا تھا اور دیکھتے دیکھتے جوان مٹیار بن گئی تھی جس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ پھوٹ کے نکل رہی تھی۔ چوہدری موجو کو اب اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی تھی۔ یہاں پھر اس کو پھاتاں یاد آتی۔ یہ کام وہ کتنی آسانی سے کر سکتی تھی۔

کھری کھاٹ پر چوہدری موجو نے اپنی نشست اور اپنا تہمد درست کرتے

ہوئے چھوڑے سے غیر معمولی لمبا کش لیا اور کھانسنے لگا۔ کھانسنے کے دوران
میں کسی کی آواز آئی: "السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!"

چوہدری مرتجو نے پلٹ کر دیکھا تو اسے سفید کپڑوں میں ایک دراز ریش بزرگ نظر آئے۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص کہاں سے آگیا ہے۔

دراز ریش بزرگ کی آنکھیں بڑی بڑی اور بارعب تھیں جن میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ لمبے لمبے پٹے تھے۔ ان کے اور داڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ سفید زیادہ اور سیاہ کم۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ کاندھے پر ریشم کا کاڑھا ہوا بسنتی رومال۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والا موٹا عصا تھا۔ پاؤں میں لال کھال کا نرم و نازک جوتا۔

چوہدری مرتجو نے جب اس بزرگ کا سراپا غور سے دیکھا۔ تو اس کے دل میں فوراً ہی اس کا احترام پیدا ہو گیا۔ چارپائی پر سے جلدی جلدی اٹھ کر وہ اس سے مخاطب ہوا: "آپ کہاں سے آئے، کب آئے؟"

بزرگ کی کتری ہوئی شرعی لبوں میں مسکراہٹ پیدا ہوئی: "فقیر کہاں سے آئیں گے۔ ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ان کے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے جدھر حکم دیا چل پڑے اور جہاں ٹھہرنے کا حکم ہوا وہیں ٹھہر گئے!"

چوہدری مرتجو پر ان الفاظ کا بہت اثر ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس

بزرگ کا ہاتھ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ چوما، آنکھوں سے لگایا۔ "چوہدری مرجو کا گھر آپ کا اپنا گھر ہے۔"

بزرگ مسکراتا ہوا کھاٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے چاندی کی موٹھ والے عصا کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس پر اپنا سر جھکا دیا۔ "اللہ جل شانہٗ کو جانے تیری کون سی ادا پسند آگئی کہ اپنے اس حقیر اور عاصی بندے کو تیرے پاس بھیج دیا۔"

چوہدری مرجو نے خوش ہو کر پوچھا۔ "تو مولوی صاحب آپ اس کے حکم سے آئے ہیں؟"

مولوی صاحب نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور کسی قدر خشم آلود لہجے میں کہا۔ "تو کیا ہم تیرے حکم سے آئے ہیں — ہم تیرے بندے ہیں یا اس کے جس کی عبادت میں ہم نے پورے چالیس برس گزار کر یہ تھوڑا بہت رتبہ حاصل کیا ہے۔"

چوہدری مرجو کانپ گیا۔ اپنے مخصوص گنوار لیکن پرخلوص انداز میں اس نے مولوی صاحب سے اپنی تقصیر معاف کرائی اور کہا۔ "مولوی صاحب، ہم جیسے انسانوں سے جن کو نماز پڑھنی بھی نہیں آتی ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں — ہم گنہگار ہیں۔ ہمیں بخشوانا اور بخشنا آپ کا کام ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنی بڑی بڑی سرمہ لگی آنکھیں بند کیں اور کہا۔ "ہم اسی لیے آئے ہیں۔"

چوہدری تو جو زمین پر بیٹھ گیا اور مولوی صاحب کے پاؤں دبانے لگا۔ اتنے

میں اس کی لڑکی جیناں آگئی۔ اس نے مولوی صاحب کو دیکھا تو گھونگھٹ چھوڑ لیا۔

مولوی صاحب نے مُندی آنکھوں سے پوچھا "کون ہے چوہدری موجو"

"میری بیٹی مولوی صاحب — جیناں!"

مولوی صاحب نے نیم وا آنکھوں سے جیناں کو دیکھا اور موجو سے کہا "ہم فقیروں سے کیا پردہ ہے — اس سے پوچھو"

"کوئی پردہ نہیں مولوی صاحب — پردہ کیسا ہوگا" پھر موجو جیناں سے مخاطب ہوا "یہ مولوی صاحب ہیں جیناں — اللہ کے خاص بندے — ان سے پردہ کیسا۔ اٹھا لے اپنا گھونگھٹ!"

جیناں نے اپنا گھونگھٹ اٹھا لیا۔ مولوی صاحب نے اپنی سرمہ لگی نظریں بھر کے اس کی طرف دیکھا اور موجو سے کہا "تیری بیٹی خوبصورت ہے چوہدری موجو!"

جیناں شرما گئی۔ موجو نے کہا "اپنی ماں پر ہے مولوی صاحب!"

"کہاں ہے اس کی ماں" مولوی صاحب نے ایک بار پھر جیناں کی جوانی کی طرف دیکھا۔

چوہدری موجو سٹپٹا گیا کہ جواب کیا دے۔

مولوی صاحب نے پھر پوچھا "اس کی ماں کہاں ہے چوہدری موجو"

موجو نے جلدی سے کہا "مر چکی ہے جی!"

مولوی صاحب کی نظریں جیناں پر گڑی تھیں۔ اس کا ردِ عمل بھانپ کر انہوں نے

سے نوجو سے کڑک کر کہا "تو جھوٹ بولتا ہے"

نوجو نے مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور ندامت بھری آواز میں کہا جی ہاں
—— جی ہاں —— میں نے جھوٹ بولا تھا —— مجھے معاف کر دیجئے —— میں بڑا جھوٹا
آدمی ہوں —— میں نے اس کو طلاق دے دی تھی مولوی صاحب"

مولوی صاحب نے ایک لمبی ہوں کی اور نظریں جیناں کی چادر پاس سے ہٹالیں اور
نوجو سے مخاطب ہوئے "تو بہت بڑا گناہ گار ہے —— کیا قصور تھا اس بے زبان کا؟"

نوجو ندامت میں غرق تھا "کچھ نہیں معلوم مولوی صاحب —— معمولی سی بات تھی
جو بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی —— میں واقعی گنہگار ہوں —— طلاق دینے کے
دوسرے دن ہی میں نے سوچا تھا کہ نوجو تو نے یہ کیا جھک ماری —— پر اس وقت
کیا ہو سکتا تھا —— چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں —— پچھتاوے سے کیا ہو سکتا تھا
مولوی صاحب"

مولوی صاحب نے چاندی کی موٹھ والا عصا نوجو کے کاندھے پر رکھ دیا "اللہ
تبارک تعالیٰ کی ذات بہت بڑی ہے —— وہ بڑا رحیم ہے ، بڑا کریم ہے —— وہ چاہے
تو ہر بگڑی بنا سکتا ہے —— اس کا حکم ہوا تو یہ حقیر فقیر ہی تیری نجات کے لیے
کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا"

ممنون و متشکر چوہدری نوجو مولوی صاحب کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گیا اور
رونے لگا۔ مولوی صاحب نے جیناں کی طرف دیکھا ، اس کی آنکھوں سے بھی اشک

رو رہاں ہے۔ ادھر آ لڑکی۔"

مولوی صاحب کے لہجے میں ایسا حکم تھا جس کو رد کرنا جیناں کے لئے ناممکن تھا روٹی اور لسی ایک طرف رکھ کر وہ کھاٹ کے پاس چلی گئی۔ مولوی صاحب نے اس کو بازو سے پکڑا اور کہا: "بیٹھ جا۔"

جیناں زمین پر بیٹھنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کا بازو اوپر کھینچا۔ "ادھر میرے پاس بیٹھ"

جیناں سمٹ کر مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر اس کو اپنے قریب کر لیا اور ذرا دبا کر پوچھا۔ "کیا لائی ہے تو ہمارے کھانے کے لیئے؟"

جیناں نے ایک طرف ہٹنا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی۔ اس کو جواب دینا پڑا۔

"جی — جی روٹیاں ہیں۔ ساگ ہے اور لسی۔"

مولوی صاحب نے جیناں کی پتلی مضبوط کمر اپنے ہاتھ سے ایک بار پھر دبائی "چل کھول کھانا اور یہیں کھلا۔"

جیناں اٹھ کر چلی گئی تو مولوی صاحب نے موجو کے کندھے سے اپنا چاندی کی موٹھ والا عصا تھپکی سی ضرب کے بعد اٹھا لیا۔ "اٹھ موجو — ہمارے ہاتھ دھلا۔"

موجو فوراً اٹھا۔ پاس ہی کنواں تھا۔ پانی لایا اور مولوی صاحب کے ہاتھ بڑے مریدانہ طور پر دھلائے۔ جیناں نے چارپائی پر کھانا رکھ دیا۔

مولوی صاحب سب کا سب کھا گئے اور جیناں کو حکم دیا کہ وہ ان کے ہاتھ

دکھلاتے۔ جیناں عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ مولوی صاحب کی شکل و صورت اور ان کی گفتگو کا انداز ہی کچھ ایسا تحکم بھرا تھا۔

مولوی صاحب نے ڈکار لے کر بڑے زور سے الحمدللہ کہا۔ داڑھی پر گیلا ہاتھ پھیرا۔ ایک اور ڈکار لی اور چارپائی پر لیٹ گئے اور ایک آنکھ بند کرکے دوسری آنکھ سے جیناں کی ڈھلکی ہوئی چدریا کی طرف دیکھتے رہے۔ اس نے جلدی جلدی برتن سمیٹے اور چلی گئی۔ مولوی صاحب نے آنکھ بند کی اور مرجو سے کہا۔ "چوہدری اب ہم سوئیں گے۔"

چوہدری کچھ دیر ان کے پاؤں دباتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ سو گئے ہیں تو ایک طرف جا کر اس نے اپلے سلگائے اور چلم میں تمباکو بھر کے بھوکے پیٹ حقہ پینا شروع کر دیا۔ مگر وہ خوش تھا۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا کوئی بہت بڑا بوجھ دور ہو گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے مخصوص گنوار مگر مخلص انداز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے اپنی جناب سے مولوی صاحب کی شکل میں فرشتۂ رحمت بھیج دیا۔

پہلے اس نے سوچا کہ مولوی صاحب کے پاس ہی بیٹھا رہے کہ شاید ان کو کسی خدمت کی ضرورت ہو، مگر جب دیر ہو گئی اور وہ سوتے رہے، تو وہ اٹھ کر اپنے کھیت میں چلا گیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کو اس بات کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ اس کو بلکہ اس بات کی بے حد مسرت تھی کہ اس کا کھانا مولوی صاحب نے کھایا اور اس کو اتنی بڑی سعادت ہوئی۔

شام سے پہلے پہلے جب وہ کھیت سے واپس آیا تو اس کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ

ہوا کہ مولوی صاحب موجود نہیں۔ اس نے خود کو بڑی لعنت ملامت کی کہ وہ کیوں چلا گیا۔ اُن کے حضور بیٹھا رہتا۔ شاید وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہوں اور کوئی بددعا بھی دے گئے ہوں۔ جب چوہدری موجو نے یہ سوچا تو اس کی سادہ رُوح لرز گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے اِدھر اُدھر مولوی صاحب کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے۔ گہری شام ہو گئی پھر بھی ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تھک ہار کر اپنے کو دل ہی دل میں کوستا اور لعنت ملامت کرتا۔ وہ گردن جھکائے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے دو جوان لڑکے گھبرائے ہوئے ملے۔ چوہدری موجو نے ان سے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی تو انہوں نے پہلے تو ٹالنا چاہا مگر پھر اصل بات بتا دی کہ وہ گھورے میں دبا ہوا شراب کا گھڑا نکال کر پینے ہی والے تھے کہ ایک نورانی صورت والے بزرگ ایک دم وہاں نمودار ہو گئے اور بڑی غضب ناک نگاہوں سے ان کو دیکھ کر یہ پوچھا کہ وہ یہ کیا حرام کاری کر رہے ہیں جس چیز کو اللہ تبارک تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ اسے پی کر اتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں جس کا کوئی کفارہ ہی نہیں۔ ان لوگوں کی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ کچھ بولیں۔ بس سر پہ پاؤں رکھ کے بھاگے اور یہاں آ کے دم لیا۔

چوہدری موجو نے ان دونوں کو بتایا کہ وہ نورانی صورت والے واقعی اللہ کو پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ پھر اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اب جانے اس گاؤں پر کیا قہر نازل ہو گا۔ ایک اس نے ان کو چھوڑ کر چلے جانے کی بڑی حرکت کی، ایک

انہوں نے کہ حرام شے نکال کر پی رہے تھے۔

"اب اللہ ہی بچائے ــــ اب اللہ ہی بچائے میرے بچّو۔" یہ بڑبڑاتا چوہدری موجو گھر کی جانب روانہ ہوا۔ جیناں موجود تھی، پر اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور خاموش کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس پر اور گاؤں پر ضرور کوئی خدائی آفت آئے گی۔

شام کا کھانا تیار تھا۔ جیناں نے مولوی صاحب کے لئے بھی پکا رکھا تھا۔ جب اس نے اپنے باپ سے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں ہیں تو اس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا "چلے گئے ــــ چلے گئے۔ ان کا ہم گنہگاروں کے ہاں کیا کام!"

جیناں کو افسوس ہوا کیونکہ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ وہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ نکالیں گے جس سے اس کی ماں واپس آجائے گی ــــ پر وہ جا چکے تھے ــــ اب وہ راستہ ڈھونڈنے والا کون تھا۔ جیناں خاموشی سے پیڑھی پر بیٹھ گئی ــــ کھانا ٹھنڈا ہوتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈیوڑھی میں آہٹ ہوئی۔ باپ بیٹی دونوں چونکے۔ موجو اٹھ کے باہر گیا اور چند لمحات میں مولوی صاحب۔ دونوں اندر صحن میں تھے۔ دیئے کی دھندلی روشنی میں جیناں نے دیکھا کہ مولوی صاحب لڑکھڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مٹکا ہے۔

موتجو نے ان کو سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا۔ مولوی صاحب نے گھڑا موتجو کو دیا اور تمکنت بھرے لہجے میں کہا "آج خدا نے ہمارا بہت کڑا امتحان لیا۔ تمہارے گاؤں کے دو لڑکے شراب کا گھڑا نکال کر پینے والے تھے کہ ہم پہنچ گئے ___ وہ ہمیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ ہم کو بہت صدمہ ہوا کہ اتنی چھوٹی عمر اور اتنا بڑا گناہ۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اسی عمر میں تو انسان رستے سے بھٹکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ان کا گناہ معاف کیا جائے ___ جواب ملا ___ جانتے ہو کیا جواب ملا؟"

موتجو نے لرزتے ہوئے کہا "جی نہیں!"

"جواب ملا ___ کیا تو ان کا گناہ اپنے سر لیتا ہے ___ میں نے عرض کی ہاں باری تعالیٰ ___ آواز آئی، تو جا یہ سارا گھڑا شراب کا تو پی ___ ہم نے ان لڑکوں کو بخشا!"

موتجو ایک ایسی دنیا میں چلا گیا جو اس کے اپنے تخیل کی پیداوار تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے "تو آپ نے پی؟"

مولوی صاحب کا لہجہ اور زیادہ تمکنت بھرا ہو گیا "ہاں پی ___ پی ___ ان کا گناہ اپنے سر لینے کے لئے پی ___ رب العزت کی آنکھوں میں سرخرو ہونے کے لئے پی ___ گھڑے میں اور بچی پڑی ہے ___ یہ بھی ہمیں پینی ہے ___ رکھ دے اسے سنبھال کے اور دیکھ اس کی ایک بوند ادھر ادھر نہ ہو۔"

مرتجو نے گھڑا اٹھا کر اندر کوٹھڑی میں رکھ دیا اور اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ واپس صحن میں آیا تو مولوی صاحب جیناں سے اپنا سر دبوا رہے تھے اور اس سے کہہ رہے تھے" جو آدمی دوسروں کے لئے کچھ کرتا ہے، اللہ جل شانہٗ اس سے بہت خوش ہوتا ہے ــــ وہ اس وقت تجھ سے بھی خوش ہے ــــ ہم بھی تجھ سے خوش ہیں۔"

اور اسی خوشی میں مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اس کو اپنے گلے سے لگا لیا اور مرتجو سے کہا" چوہدری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اٹھا ہے۔"

چوہدری سرتاپا ممنون و متشکر تھا۔" یہ سب آپ کی دعا ہے ــ آپ کی مہربانی ہے۔"

مولوی صاحب نے جیناں کو ایک مرتبہ پھر اپنے سینے کے ساتھ بھینچا۔" اللہ مہربان سو کل مہربان ــــ جیناں ہم تجھے ایک وظیفہ بتائیں گے۔ وہ پڑھا کرنا۔ اللہ ہمیشہ مہربان رہے گا۔"

دوسرے دن مولوی صاحب بہت دیر سے اٹھے۔ مرتجو ڈر کے مارے کھیتوں پر نہ گیا۔ صحن میں ان کی چارپائی کے پاس بیٹھا رہا۔ جب وہ اٹھے تو ان کو مسواک کرائی، نہلایا دھلایا۔ اور ان کے ارشاد کے مطابق شراب کا گھڑا لا کر ان کے

پاس رکھ دیا۔ مولوی صاحب نے کچھ پڑھا، گھڑے کا منہ کھول کر اس میں تین بار پھونکا اور دو تین کٹورے چڑھا گئے۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ کچھ پڑھا اور تمکنت آمیز انداز میں کہا "ہم تیرے ہر امتحان میں پورے اتریں گے مولا"۔ پھر وہ چوہدری سے مخاطب ہو گئے "مرجو جا ۔۔۔ حکم ملا ہے کہ ابھی جا اور اپنی بیوی کو لے آ ۔۔۔ راستہ مل گیا ہے ہمیں"۔

مرجو بہت خوش ہوا۔ جلدی جلدی اس نے گھوڑی پر زین کسی اور کہا کہ وہ دوسرے روز صبح سویرے پہنچ جائے گا۔ پھر اس نے جیناں سے کہا کہ وہ مولوی صاحب کی ہر آسائش کا خیال رکھے اور خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے

جیناں برتن مانجھنے میں مشغول ہو گئی۔ مولوی صاحب چارپائی پر بیٹھے اسے گھورتے اور شراب کے کٹورے پیتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے جیب سے موٹے موٹے دانوں والی تسبیح اٹھائی اور پھیرنا شروع کر دی۔ جب جیناں کام سے فارغ ہو گئی تو انہوں نے اس سے کہا "جیناں مجھے وضو کرا دو"۔

جیناں نے بڑے بھولپن سے جواب دیا "مجھے نہیں آتا مولوی جی"۔

مولوی صاحب نے بڑے پیار سے اس کو سرزنش کی "وضو کرنا نہیں آتا ہے۔ کیا جواب دے گی اللہ کو"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اس کو وضو کرایا اور ساتھ ساتھ اس انداز سے ٹٹولتے رہے کہ وہ اس کے بدن کے ایک ایک کونے کھدرے کو جھانک جھانک کر دیکھ سکیں۔

وضو کرانے کے بعد مولوی صاحب نے جانماز مانگی۔ وہ نہ ملی تو پھر ڈانٹا، مگر

اسی انداز میں۔ کٹیس منگوایا اس کو اندر کی کوٹھری میں بچھایا اور جیناں سے کہا کہ باہر کی کنڈی لگا دے۔ جب کنڈی لگ گئی تو اس سے کہا کہ گھڑا اور کٹورا اٹھا کے اندر لے آ۔ وہ لے آئی۔ مولوی صاحب نے آدھا کٹورا بھرا اور آدھا اپنے سامنے رکھ لیا اور تسبیح پھیرنا شروع کر دی جیناں ان کے پاس خاموش بیٹھی رہی۔

بہت دیر تک مولوی صاحب آنکھیں بند کیے اسی طرح وظیفہ کرتے رہے۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ کٹورا جو آدھا بھرا تھا، اس میں تین پھونکیں ماریں اور جیناں کی طرف بڑھا دیا۔ "پی جاؤ اسے۔"

جیناں نے کٹورا پکڑ لیا مگر اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مولوی صاحب نے بڑے جلال بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا "ہم کہتے ہیں پی جاؤ۔۔۔ تمہارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

جیناں پی گئی، مولوی صاحب اپنی پتلی لبوں میں مسکرائے اور اس سے کہا "ہم پھر اپنا وظیفہ شروع کرتے ہیں۔ جب شہادت کی انگلی سے اشارہ کریں تو آدھا کٹورا گھڑے سے نکال کر فوراً پی جانا۔۔۔ سمجھ گئیں۔"

مولوی صاحب نے اس کو جواب کا موقعہ ہی نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔۔۔ جیناں کے منہ کا ذائقہ بے حد خراب ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سینے میں آگ سی لگ گئی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیئے۔ پر وہ کیسے اٹھ سکتی تھی۔ جلن کو حلق اور سینے میں لئے دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کے بعد ایک دم

مولوی صاحب کی شہادت کی انگلی زور سے اٹھی۔ جیناں کو جیسے کسی نے ہپناٹزم کر دیا تھا۔ فوراً اس نے آدھا کٹورا بھرا اور پی گئی۔ تھوکنا چاہا مگر اٹھ نہ سکی۔

مولوی صاحب اسی طرح آنکھیں بند کئے تسبیح کے دانے کھٹاکھٹ پھیرتے رہے۔ جیناں نے محسوس کیا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے اور جیسے اس کو نیند آرہی ہے پھر اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یوں محسوس کیا کہ وہ کسی بے داڑھی مونچھ والے جوان مرد کی گود میں ہے اور وہ اسے جنت دکھانے لے جا رہا ہے۔

جیناں نے جب آنکھیں کھولیں تو وہ کھیس پر لیٹی تھی۔ اس نے نیم وا مخمور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور یہاں کیوں لیٹی تھی، کب لیٹی تھی کے متعلق سوچنا شروع کیا تو اسے سب کچھ دھند میں لپٹا نظر آیا۔ وہ پھر سونے لگی۔ لیکن ایک دم اٹھ بیٹھی۔ مولوی صاحب کہاں تھے ؟ — اور وہ جنت؟

کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ باہر صحن میں نکلی تو دیکھا کہ دن ڈھل رہا ہے اور مولوی صاحب گھڑے کے پاس بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ آہٹ سن کر انہوں نے پلٹ کر جیناں کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ جیناں واپس کوٹھڑی میں چلی گئی اور کھیس پر بیٹھ کر اپنی ماں کے متعلق سوچنے لگی جس کو لانے اس کا باپ گیا ہوا تھا — پوری ایک رات باقی تھی ان کی واپسی میں۔

اور اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کچھ پکایا ریندھا نہیں تھا۔

اس کے چھوٹے سے مضطرب دماغ میں بے شمار باتیں آرہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب نمودار ہوئے اور یہ کہہ کر چلے گئے۔

"میں تمہارے باپ کے لئے ایک وظیفہ کرتا ہوں ــــ ساری رات کسی قبر کے پاس بیٹھنا ہوگا ــــ صبح آجاؤں گا ــــ تمہارے لئے بھی دعا مانگوں گا۔"

مولوی صاحب صبح سویرے نمودار ہوئے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرمے کی تحریر غائب تھی بے حد سرخ تھیں۔ ان کے لہجے میں لکنت تھی اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ۔ صحن میں آتے ہی انہوں نے مسکرا کر جیناں کی طرف دیکھا۔ آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگایا۔ اس کو چوما اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جیناں ایک طرف کونے میں پیڑھی پر بیٹھ گئی اور گذشتہ دھندلے واقعات کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کو اپنے باپ کا بھی انتظار تھا جس کو اس وقت تک پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ ماں سے بچھڑے ہوئے اس کو دو برس ہو چکے تھے . . . . اور جنت . . . . وہ جنت . . . . کیسی تھی وہ جنت؟! ــــ کیا وہ مولوی صاحب تھے؟ ــــ مگر اس کو دھندلا سا خیال تھا کہ وہ آدمی داڑھی والا نہیں تھا۔ کوئی جوان تھا۔

مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد اس سے مخاطب ہوئے۔ "جیناں، ابھی تک وہ نہیں آیا۔"

جیناں خاموش رہی۔

مولوی صاحب پھر اس سے مخاطب ہوئے۔ "اور میں ساری رات ایک

ٹوٹی پھوٹی قبر پر سر نیوڑھائے سنسان رات میں اس کے لیے وظیفہ پڑھتا رہا۔

"... کب آئے گا وہ؟ ـــ کیا وہ لے آئے گا تمہاری ماں کو؟"

جیناں نے صرف اس قدر کہا "جی معلوم نہیں ـــ شاید آتے ہی ہوں۔
ـــ آجائیں گے ـــ اماں بھی آجائے گی ـــ پر ٹھیک پتا نہیں۔"

اتنے میں آہٹ ہوئی ـــ جیناں اٹھی۔ اس کی ماں نمودار ہوئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ مہجو آیا تو اس نے مولوی صاحب کو بڑے ادب اور احترام کے ساتھ سلام کیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا "پھاتاں
ـــ سلام کرو مولوی صاحب کو۔"

پھاتاں اپنی بیٹی سے الگ ہوئی۔ آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھی اور مولوی صاحب کو سلام کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی لال لال آنکھوں سے اس کو گھور کے دیکھا اور مہجو سے کہا "ساری رات قبر کے پاس تمہارے لیے وظیفہ کرتا رہا ـــ ابھی ابھی اٹھ کے آیا ہوں ـــ اللہ نے میری سن لی ہے ـــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

چوہدری مہجو نے فرش پر بیٹھ کر مولوی صاحب کے پاؤں دابنے شروع کر دیے۔ وہ اتنا ممنون و متشکر تھا کہ کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ بیوی سے مخاطب ہو کر اس نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا "ادھر آ پھاتاں ـــ تو ہی مولوی صاحب کا شکریہ ادا کر ـــ
مجھے تو نہیں آتا۔"

پھاتاں اپنے خاوند کے پاس بیٹھ گئی۔ پر وہ صرف اتنا کہہ سکی "ہم غریب

کیا ادا کر سکتے ہیں"۔

مولوی صاحب نے غور سے پھاتاں کو دیکھا: "موجو چوہدری۔ تم ٹھیک کہتے تھے۔ تمہاری بیوی خوبصورت ہے ۔۔۔ اس عمر میں بھی جوان معلوم ہوتی ہے۔ بالکل دوسری جیناں ۔۔۔ اس سے بھی اچھی ۔۔۔ ہم سب ٹھیک کر دیں گے پھاتاں۔ ۔۔۔ اللہ کا فضل و کرم ہو گیا ہے"۔

میاں بیوی دونوں خاموش رہے۔ موجو مولوی صاحب کے پاؤں دباتا رہا۔ جیناں چولہا سلگانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب اٹھے۔ پھاتاں کے سر پہ ہاتھ سے پیار کیا اور موجو سے مخاطب ہوئے: "اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے اور پھر اس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے، پھر جائز ہے"۔

موجو نے ہولے سے کہا: "یہ میں سن چکا ہوں مولوی صاحب"۔

مولوی صاحب نے موجو کو اٹھایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: "لیکن ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے غریب کو۔ اس سے بھول ہو گئی ہے ۔۔۔ آواز آئی ۔۔۔ ہم ہر روز تیری سفارشیں کب تک سنیں گے تو اپنے لئے جو بھی مانگ ہم دینے کے لئے تیار ہیں ۔۔۔ میں نے عرض کی میرے شہنشاہ ۔۔۔ بحر و بر کے مالک ۔۔۔ میں اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا ۔۔۔ تیرا دیا میرے

پاس بہت کچھ ہے ـــ مرجو چوہدری کو اپنی بیوی سے محبت ہے ـــ اسے خوشی تھی ـــ تو ہم اس کی محبت اور تیرے ایمان کا امتحان لینا چاہتے ہیں ـــ ایک دن کے لئے تو اس سے نکاح کر لے۔ دوسرے دن طلاق دے کر مرجو کے حوالے کر دینا ـــ ہم تیرے لئے بس صرف یہی کر سکتے ہیں کہ تو نے چالیس برس دل سے ہماری عبادت کی ہے۔"

موجو بہت خوش ہوا۔ "مجھے منظور ہے مولوی صاحب ـــ مجھے منظور ہے" اور جیاناں کی طرف اس نے تمتماتی آنکھوں سے دیکھا۔ "کیوں جیاناں؟" مگر اس نے جیاناں کے جواب کا انتظار نہ کیا۔ "ہم دونوں کو منظور ہے۔"

مولوی صاحب نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ پڑھا۔ دونوں کے پھونک ماری اور آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ "اللہ تبارک تعالیٰ۔ ہم سب کو اس امتحان میں پورا اتارے۔" پھر وہ موجو سے مخاطب ہوئے۔ "اچھا مرجو ـــ میں اب چلتا ہوں ـــ تم اور جیناں آج کی رات کہیں چلے جانا۔ صبح سویرے آجانا۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب چلے گئے۔

جیناں اور موجو تیار تھے۔ جب شام کو مولوی صاحب واپس آئے تو انہوں نے ان سے بہت مختصر باتیں کیں۔ وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے اشارہ کیا۔ جیناں اور موجو فوراً چلے گئے۔

مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی اور پھاتاں سے کہا "تم آج کی رات بسری ہوئی ہو ـــــ جاؤ اندر سے بستر لاؤ اور چارپائی پر بچھاؤ۔ ہم سوئیں گے۔"

پھاتاں نے اندر کوٹھڑی سے بستر لا کر چارپائی پر بڑے سلیقے سے لگا دیا

مولوی صاحب نے کہا "بی بی۔ تم بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی میں چلے گئے۔ اندر دیا روشن تھا۔ کونے میں برتنوں کے منارے کے پاس ان کا گھڑا رکھا تھا۔ انہوں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ تھوڑی سی باقی تھی۔ گھڑے کے ساتھ ہی منہ لگا کر انہوں نے کئی بڑے بڑے گھونٹ پیے۔ کاندھے سے ریشمی پھولوں والا بسنتی رومال اتار کر مونچھیں اور ہونٹ صاف کئے اور دروازہ بھیڑ دیا۔

پھاتاں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ کافی دیر کے بعد مولوی صاحب نکلے۔ ان کے ہاتھ میں کٹورا تھا۔ اس پر تین دفعہ پھونک کر انہوں نے پھاتاں کو پیش کیا "لو اسے پی جاؤ۔"

پھاتاں پی گئی۔ قے آنے لگی تو مولوی صاحب نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا "ٹھیک ہو جاؤ فوراً۔"

پھاتاں نے کوشش کی اور کسی قدر ٹھیک ہو گئی۔ مولوی صاحب لیٹ گئے

صبح سویرے جیناں اور موجو آئے تو انہوں نے دیکھا کہ صحن میں پھاتاں سو

یہی ہے کہ مولوی صاحب موجود نہیں۔ مرجو نے سوچا۔ باہر گئے ہوں گے کھیتوں میں۔ اس نے پھاتاں کو جگایا۔ پھاتاں نے غوں غوں کر کے آہستہ آنکھیں کھولیں۔ پھر بڑبڑائی: "جنت ــــ جنت"۔ لیکن جب اس نے مرجو کو دیکھا تو پوری آنکھیں کھول کر بستر میں بیٹھ گئی۔

مرجو نے پوچھا "مولوی صاحب کہاں ہیں؟"

پھاتاں ابھی تک پورے ہوش میں نہیں تھی: "مولوی صاحب ــــ کون مولوی صاحب ــــ وہ تو . . . . پتا نہیں کہاں گئے ــــ یہاں نہیں ہیں؟"

"نہیں" مرجو نے کہا "میں دیکھتا ہوں انہیں باہر"۔

وہ جا رہا تھا کہ اسے پھاتاں کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ پلٹ کر اس نے دیکھا۔ تکیئے کے نیچے سے وہ کوئی کالی کالی چیز نکال رہی تھی ــــ جب پوری نکل آئی۔ تو اس نے کہا "یہ کیا ہے؟"

مرجو نے کہا: "بال"۔

پھاتاں نے بالوں کا وہ گچھا فرش پہ پھینک دیا۔ مرجو نے اسے اٹھا لیا اور غور سے دیکھا: "داڑھی اور پٹے"۔

جیناں پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ بولی: "مولوی صاحب کی داڑھی اور پٹے"

پھاتاں نے وہیں چارپائی سے کہا: "ہاں ــــ مولوی صاحب کی داڑھی اور پٹے"۔

وہ حیرت عجیب چکر میں پڑ گیا: "اور مولوی صاحب کہاں ہیں؟" لیکن فوراً ہی اس کے سادہ اور بے لوث دماغ میں ایک خیال آیا۔ "جیناں ۔۔۔ پھاتاں تم نہیں سمجھیں ۔۔۔ وہ کوئی کرامات والے بزرگ تھے۔ ہمارا کام کر گئے اور یہ نشانی چھوڑ گئے۔"

اس نے ان بالوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور ان کو جیناں کے حوالے کر کے کہا: "جاؤ، ان کو کسی صاف کپڑے میں لپیٹ کر بڑے صندوق میں رکھ دو ۔۔۔ خدا کے حکم سے گھر میں برکت ہی برکت رہے گی۔"

جیناں اندر کوٹھڑی میں گئی تو وہ پھاتاں کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے کہنے لگا: "میں اب نماز پڑھنا سیکھوں گا اور اس بزرگ کے لئے دعا کیا کروں گا جس نے ہم دونوں کو پھر سے ملا دیا۔"

پھاتاں خاموش رہی۔

افسانے	زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	۴/-
	طلسمِ خیال	کرشن چندر	۵/۵۰
	ان داتا	کرشن چندر	۵/۵۰
	تین غنڈے	کرشن چندر	۴/-
	ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	۴/-
	پانی کا درخت	کرشن چندر	۶/-
	نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو	۵/-
	لذت سنگ	سعادت حسن منٹو	۴/-
	سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو	۵/-
	گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۵/-
	دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۵/۵۰
	کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	۶/۵۰
	لمبی لڑکی	راجندر سنگھ بیدی	۴/۵۰
	لاجونتی	راجندر سنگھ بیدی	۴/۵۰
	اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	۶/-
	رفیق تنہائی	علی عباس حسینی	۷/-
	ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۵/-
	سناٹا	احمد ندیم قاسمی	۷/-
	توبہ توبہ	واجدہ تبسم	۷/-
	جدید ہندی افسانے (ترجمہ و انتخاب)		۵/-
	ایک بات	عصمت چغتائی	۵/-
	دوزخ	عصمت چغتائی	۵/۵۰
	منزل منزل	اے حمید	۸/-
	خلا نوردوں کے افسانے	محمد سلیم الرحمٰن	۵/-
	چٹان	اوپندر ناتھ اشک	۴/۵۰
	جگا	بلونت سنگھ	۸/-
ناول	سودائی	عصمت چغتائی	۵/-
	ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۶/-
	کالے کوس	بلونت سنگھ	۸/-